پیشہ رزقِ حلال

اور

اربابِ علم و کمال

مولانا عبدالقیوم حقانی

العلا پبلیکیشنز

نئی دہلی ۲۵

نام کتاب ــــــ پیشۂ رزقِ حلال اور ارباب علم و کمال

تصنیف ــــــ مولانا عبد القیوم حقّانی

پرنٹرز

ناشر العُلا پبلیکیشنز نئی دہلی

قیمت

ملنے کے پتے

خصوصی تقسیم کار

۱۔ کتب خانہ عزیزیہ ۔ جامع مسجد دہلی

۲۔ مرکزی مکتبہ اسلامی چتلی قبر دہلی

۳۔ روشنی پبلیکیشنز ۔ بازار نصر اللہ خاں رامپور

۴۔ مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
پوسٹ بکس ۹۳

آئینۂ کتاب

سخنہائے گفتنی

حَامِدًا وَّمُصَلِّیًا!

ایمانی قوت، دینی حمیت، مذہبی و اخلاقی روح، علمی و عملی خدمتوں کے اعتبار سے اسلام کے خیر القرون کے زریں ادوار کے علماء و فضلاء اور مشائخ، مفسرین و محدثین، ائمہ مجتہدین اور مصلحینِ امت کو سبقت و فضل کا معیاری مقام حاصل ہے یا پھر ان ہی کے ورثاء علماء دین اور فضلاء علم اور سلف صالحین کا درجہ ہے، جو دینی اور دُنیوی سعادت و فلاح کے معراجِ کمال کو پہنچے جو علم و عمل میں صحابۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پرتو تھے، انہوں نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات اور حضراتِ صحابہؓ کی علمی اور اخلاقی وراثت کو مسلمانوں میں پھیلایا، عہدِ رسالت سے بُعد، مادیت کے غلبے، شخصی حکومتوں کے مظالم اور مختلف لادین تہذیبوں کی یلغار، لادین نظریات کے گرد و غبار اور کدورات و اثرات سے اسلام کے مصفا سرچشمہ کو اپنی کوششوں سے محفوظ اور مصئون رکھا، مذہبی علوم و معارف کی حفاظت و اشاعت کی، اسلام کو پھیلایا، علم و عمل کے ہر شعبہ میں مسلمانوں کے لیے بہترین اُسوہ چھوڑا، اُن کا اہم اور لازوال کارنامہ یہ ہے کہ اُنہوں نے دینی علوم کی (جس پر مذہب اسلام کا دار و مدار ہے) حفاظت و اشاعت اور قرآن و حدیث سے متفرع علوم کی تاسیس کی ہے۔ اگر ان بزرگوں نے جانکاہ تکلیفیں اور مشقتیں اٹھا کر اس خزانہ کو محفوظ نہ کیا ہوتا تو اس کا بڑا حصہ برباد ہو جاتا مگر اب کے دور میں مغربی افکار کی یلغار سے نسلِ نو کے تصورات اور سلف صالحین سے قلبی وابستگیاں اس قدر مسخ ہو چکی ہیں کہ انہیں خیر و شر کی تمیز ہی نہیں رہی۔ آج مصریوں کا طبقۂ نو تہذیب فرعون کو اچھال رہا ہے۔ لبنان میں ابو جہل اکاڈمی کی بنا ڈال دی گئی ہے کچھ لوگ تہذیب چنگیز کی پرستاری پر فخر کر رہے ہیں، سندھ میں راجہ داہر کو ہیرو قرار

دینے کی تحریک چل رہی ہے۔ کچھ سرکاری مورخ ایسے بھی ہیں جو گندھارا اور موہنجوڈارو کی تہذیب پر نازاں ہیں اور بعض نے اپنی پسند کے کھیل اور کھلاڑیوں کو اپنا دیوتا بنا لیا ہے۔ مگر ان منسوب الیہ ناموں اور فنا شدہ تہذیبوں کے پاس بت پرستی، ابتدائی سنگ تراشی، بھدی سی نقاشی، بدہیئت اوزاروں اور برتنوں کے سوا اور کیا تھا؟ فرعون کی داستانہائے جور و ستم پر قرآن گواہ ہے، ابوجہل کی جہالت ہٹ دھرمی اور ہدایت دشمنی کا دوسرا نام ہے، چنگیز کا کام شہروں کو ڈھانا، کتابوں کو جلانا اور علماء کو مارنا تھا، راجہ داہر ایک عیاش اور بدمست والی تھا۔

مگر دینِ اسلام ایک ایسے زمانے میں ابھرا جب بحر اسکاہل سے بحرِ اوقیانوس تک ایک چراغ بھی کہیں فروزاں نہ تھا اور ایسے خطے سے ابھرا جو جہالت، بربریت اور بدکاری میں ضرب المثل تھا۔ یہ مشرق و مغرب کی طرف ابرِ بہار بن کر بڑھا اور ہر نشیب و فراز کو سیراب کرتا چلا گیا۔ یہ ایک کاروان تھا جس کی قیادت خلفاء راشدینؓ حضراتِ صحابہؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ، ائمہ متبوعینؒ اور سلف صالحینؒ کر رہے تھے۔ جوں جوں آگے بڑھتا گیا لوگ فوج در فوج اس میں شامل ہوتے گئے اور يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا کے مظاہر کھلی آنکھوں سامنے آتے گئے۔

حاملینِ علومِ نبوت اور صالحینِ امت کی مساعی سے جہالت اور بربریت کا دور لد گیا، دنیا امن کا گہوارہ اور بہشت کا نمونہ بن گئی ـــــ یہ حضرات کون تھے؟ سرمایہ دار، جاگیردار، کارخانے دار، بینک بیلنس والے، کوٹھیوں اور بنگلوں والے حکمران تھے، وزیر تھے، جاہ و منصب کے مالک تھے، ان کے پاس فوجی قوت زیادہ تھی۔ وہ ٹینکوں، بکتربند گاڑیوں، کلاشنکوفوں، خودکار آتشیں اسلحوں، جنگی جہازوں، میزائلوں اور ایٹم بم سے مسلح تھے؟ نہیں ہرگز نہیں! یہ نادار مفلس قلاش، مزدور کار، صنعت کار، کسان، لوہار اور بڑھئی تھے، اپنے ہاتھوں سے جوتیاں گانٹھتے، کپڑے بنتے، کدالیں چلاتے، سڑکیں کھودتے، کھیتی باڑی کرتے ـــــ ہل جوتتے، روغن سازی اور صابون سازی کا کام کرتے، ریشم کے کیڑے پالتے، بازار میں گوشت بیچ کرتے! اون کا کام کرتے، پارچہ بافی سے رزقِ حلال کماتے،

درختوں کی چھال اور پتے ابال کر کھاتے، مگر اس سب کچھ کے باوجود انہوں نے اپنے عمل و کردار اپنی مساعی اور اہداف سے اسلام کی آبرو پر آنچ نہیں آنے دی۔ اپنے بے ریا کردار، اپنی بے مثال جدوجہد، اپنی قربانی و ایثار، اپنی حفاظت و اشاعتِ علم کی مساعی اور عظیم قومی و ملی، علمی و روحانی اور اسلامی خدمات کی وجہ سے تاریخ کے آسمانِ عظمت پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے —— ہر پیشہ اور ہر طبقہ سے تعلق رکھنے والے ان مسلمانوں نے دینی علوم و معارف کو اپنے لیے اصل سرمایۂ افتخار سمجھا، انہوں نے معاشی کاروبار کے ساتھ ساتھ علمی کاروبار بھی جاری رکھا، وہ کسبِ معیشت کے ساتھ ساتھ علمِ دین کی ضرورت کے قائل تھے، چرواہوں نے اپنی چراگاہوں کو حکمت و معرفت کا مدرسہ بنایا، کاشتکاروں نے اپنے کھیتوں میں علم و فضل کی کاشتکاری کی، زمینداروں اور مزدوروں نے اپنے کو علم کے سانچے میں ڈھال کو مخدومیت کا شرف حاصل کیا، کاریگروں نے اپنی دستکاری اور صنعت و حرفت کے جھمیلوں میں تعلیم و تدریس کا شغل جاری رکھا اور تاجروں نے اپنی دوکانوں سے علمِ دین کی متاع مفت لٹوائی اور اسلام کی دینی اور اخلاقی قدروں کو فروغ اور عروج بخشا۔

اگر اخلاقی قدریں اور قومی ترقی خون کے دریا بہانے، کتابیں پھاڑنے، غریب عوام کے مال پر عیش اڑانے، لہو و لعب، کھیلنے کودنے اور مزدوروں کو پنجالی میں جوت کر چابک مارنے کا نام ہے تو پھر فرعون، چنگیز خان، راجہ داہر واقعی ہیرو تھے اور اس قابل تھے کہ ان سے عشق و محبت کر کے ان کے نام اور کام کو دلوں کی دھڑکن بنا لیا جائے، اور اگر اس کا مفہوم کچھ اور ہے تو پھر ایسے خونخوار بھیڑیوں اور انسان نما درندوں کو اپنا آئیڈیل قرار دینے کی کیا واقعیت ہو سکتی ہے۔

آئندہ صفحات میں ہم قارئین کی ایسے لوگوں سے معرفت اور ملاقات کرانا چاہتے ہیں جنہیں دنیوی جاہ و منزلت اور مال و دولت کے لحاظ سے نہیں بلکہ علم و عرفان، قومی و ملی اور دینی خدمات اور اپنے بلند علمی و روحانی کردار نے قیامت تک زندہ و جاوید بنا دیا۔ جن کا کردار پختہ، جن کے عزائم اٹل اور جن کی مساعی انسانیت کی آبرو تھیں، جن کی مشقتوں اور جدوجہد کے بدلے ہمیں سچے دین سے وابستگی کی دولت ملی، خدا کرے کہ واقعتہً نسلِ نو کو اس نسبت و تعلق

پر مسرت ہو۔

جہاں تک اپنی اس کتاب کے تعارف کی بات ہے، مجھے حیرت ہے کہ خود لکھنے والے کو معلوم نہیں کہ یہ کیا ہے؟ سوانح و تذکرہ ہے؟ تاریخ کا ایک باب ہے؟ علم اور علماء کی فضیلت پر مفصل مقالہ ہے؟ رزقِ حلال اور کسبِ معاش کی ضرورت پر جدید طرز کی نئی تصنیف ہے؟ معاشرہ میں اہلِ علم کے کردار پر واقعاتی شواہد کو مرتب کیا گیا ہے؟ بعض انساب کی توضیح و تشریح پر مشتمل جدید ادبی تحریر ہے یا پھر امام علامہ عبدالکریم سمعانیؒ سے مطالعاتی کسبِ فیض اور استفادہ کی اجمالی روئیداد ہے؟ غرض جو کچھ بھی ہے دردِ دل اور سوزِ دروں سے خالی نہیں، جگر لختِ لخت کو جمع کر دیا گیا ہے اور دعوتِ مژگان اس پر مستزاد۔ اور اگر اس جگہ پس منظر کی قدرے توضیح کر دی جائے تو اصل حقیقت بھی واضح ہو جائے گی اور پیش منظر کے سمجھنے میں زیادہ آسانی رہے گی۔

دراصل ہوا یہ تھا کہ آج سے کوئی تین سال قبل ماہنامہ الحق کے لیے علامہ عبدالکریم سمعانیؒ کی لازوال شاہکار "کتاب الانساب" کا تعارف لکھنے بیٹھا تھا ورق اُلٹے پلٹے، مضامین دیکھے، قلم ہاتھ میں لیا، مگر تدبیر پر تقدیر غالب آئی، بجائے اس کے کہ "کتاب الانساب" کے تعارف پر مروجہ طریقے کے مطابق مفصل مقالہ تحریر کیا جاتا بغیر کسی پہلے سے ارادہ کے علامہ سمعانیؒ کے فیوضات و برکات اور افادات کے وہ مضامین جو انہوں نے مختلف پیشوں کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے اربابِ علم و فضل کے تذکرہ میں ارقام فرمائے تھے یا اشارات کر دیئے تھے ضبطِ تحریر میں آ گئے اور ایک مختصر سا مقالہ جو مختلف پیشوں اور طبقوں سے تعلق رکھنے والے اربابِ علم و فضل کے حالات و کمالات کے تذکرہ پر مشتمل تھا "علامہ عبدالکریم سمعانیؒ سے ایک ملاقات" (دارالعلوم حقانیہ کے کتب خانہ میں) کے عنوان سے ماہنامہ الحق ۱۹۸۵ء میں شائع کرا دیا۔ قارئین کا اخلاص تھا یا وقت کی ضرورت۔ استاذِ محترم حضرت مولانا سمیع الحق صاحب دامت برکاتہم کی تحریک اور زبردست ہمت افزائی کے ساتھ ساتھ مختلف مقامات سے بزرگوں اور احباب کے خطوط آئے اور ادھر پہلے سے قلب میں یہ داعیہ بھی پیدا ہو چکا تھا کہ اس سلسلہ مضمون کو آگے بڑھایا جائے۔

توفیقِ ایزدی نے یاوری کی۔ علامہ سمعانیؒ سے کتابی اور مطالعاتی ملاقاتوں، کسبِ فیض اور استفادہ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ لمبی لمبی ملاقاتیں اور طویل نشستیں ہوتی رہیں، ان کے فیوض و برکات سے استفادہ اور افادات کے ضبط و اشاعت کے جو لمحات بھی ملے اُن کو غنیمت سمجھا۔ نئی اور جدید طرز کی اس تحریر کو بحمد اللہ پسند کیا گیا۔ اصلاً ماہنامہ الحق میں یہ سارا سلسلہ ہائے مضامین شائع ہوتا رہا۔ قدیم دینی درسگاہ جامعہ خیر المدارس ملتان کے ماہنامہ ترجمان "الخیر" کے مدیر محترم برادرم مولانا محمد ازہر صاحب مدظلہ نے بھی اس سلسلہ مضامین کو اپنی گرانقدر ادارتی تحریر کے ساتھ شائع فرمایا۔ اقراء ڈائجسٹ کراچی، الفاروق کراچی، النصیحہ چارسدہ، الحسن لاہور اور ہفت روزہ خدام الدین لاہور میں بھی بعض قسطیں شائع ہوتی رہیں۔ ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی یونیورسٹی اور عالم اسلام کے مرکزِ علمی دار العلوم دیوبند (ہندوستان) کے ترجمان ماہنامہ "دار العلوم" نے بھی ستمبر ۱۹۸۵ء کی اشاعت میں ہمارے اس سلسلہ مضامین کی پہلی قسط شائع کی اور پھر یہ سلسلہ اشاعت وقفے وقفے سے بڑے اہتمام کے ساتھ مسلسل چلتا رہا جو تا ہنوز جاری ہے۔ حتیٰ کہ اب کے تازہ شمارہ "دار العلوم" جون ۱۹۸۹ء میں قسط ۹ "قصابوں کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے اربابِ فضل و کمال" شائع ہوگئی ہے۔

اُستاذی و استاذ العلماء محدث کبیر شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ کے بعض مضامین خود سُنے اور وقتاً فوقتاً اپنے اشتیاق اور انتظار کا بھی اظہار فرمایا۔ اپنے محسن و مُربّی اُستاذِ محترم حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ مدیر ماہنامہ الحق نے اپنے مؤقر جریدہ میں اس سلسلہ مضامین کو بڑے اہتمام سے شائع فرمایا اور کاہے گاہے طلبۂ دورۂ حدیث کے سامنے درسِ ترمذی میں علماء سلف کے تعب و محن اور کسبِ معاش کے تذکرہ کی مناسبت سے احقر کے ان مضامین کی اہمیت اور مطالعہ کی ضرورت بیان فرماتے اور طلبہ کو ان کے پڑھنے اور استفادہ کی بھرپور ترغیب بھی دیتے رہے اور میری درخواست پر اس کتاب کے لیے گرانقدر پیش لفظ تحریر فرما کر ہمت افزائی اور سرفرازی سے نوازا۔

محقق العصر شیخ الحدیث حضرت العلامہ مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کے گرانقدر رائے و تبصرہ کے ساتھ ان کا حوصلہ افزا مکتوبِ گرامی مزید ہمت آفرینی اور حوصلہ افزائی و

سرفرازی کا موجب ہوا۔ استاذِ محترم ریحانۃ العصر حضرت مولانا محمد حسن جان صاحب مدظلہ العالی کے وقیع مکتوب نے ائمہ امت اور سلف صالحین کی وسیع الظرفی، اخلاق و تواضع اور اصاغر کی ہمت آفرینیوں کے تاریخی تسلسل کے حُسن و جمال کو مزید نکھار بخشا۔

ادھر ملک و بیرونِ ملک اپنے اکابر اساتذہ، بعض مشائخ، علماء اور دانشور حضرات کے اس پر تبصرے، گرانقدر آراء، تاثرات اور اس کی ضرورت و اہمیت سے متعلق گرانقدر مضامین موصول ہوئے جن میں بعض ماہنامہ الحق میں بھی شائع ہوئے۔

استاذ العلماء، محدثِ کبیر، قائدِ شریعت، شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمہ اللہ، فقیہ العصر، مفتی اعظم، شیخ الحدیث حضرت العلامہ مولانا مفتی محمد فرید صاحب دامت برکاتہم، حضرت العلامہ مولانا افتخار فریدی صاحب (مراد آباد، بھارت) حضرت العلامہ مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی صاحب دامت برکاتہم، شیخ التفسیر حضرت العلامہ مولانا قاضی عبدالکریم صاحب دامت برکاتہم، حضرت العلامہ مولانا انوار الحق صاحب دامت برکاتہم، برادرِ مکرم حضرت العلامہ مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب مدظلہ العالی، حضرت العلامہ مولانا مفتی مدد اللہ مدد آر نقشبندی مدظلہ العالی، حضرت العلامہ مولانا قاضی عبدالحلیم صاحب مدظلہ العالی، جناب پروفیسر حافظ خالد محمود ترمذی، جناب شیر بہادر خان پنی مرحوم (ایبٹ آباد) اور مولانا نعیم اللہ فاروقی مدظلہ کے مفصل اور مختصر مضامین بطورِ خاص شائع کیے گئے، جن کے بعض حصوں کو اس کتاب میں بھی بطور تبرک و تبصرہ اور تاثرات کے اور اس سے بھی بڑھ کر اُن کی اپنی جامعیت و نافعیت کے پیشِ نظر شائع کیا جا رہا ہے۔

بہرحال اگلے صفحات میں مختلف پیشوں اور مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے علماء و فضلاء، مشائخ، محدثین، مفسرین اور ائمہ و مجتہدین کے علمی و دینی حالات علامہ سمعانیؒ سے ملاقات کی صورت میں پیش کیے جا رہے ہیں جنہوں نے پیشہ کو ہمیشہ وسیلہ رزق سے بڑھ کر کچھ نہیں سمجھا جن کی ذات پر قیامت تک اسلامی علوم اور مسلمان قوم کو ناز رہے گا۔

کتاب کے آخر میں اہلِ علم، اربابِ دانش اور خالص علمی و تحقیقی، فلسفی اور حکیمانہ مباحث کا ذوق رکھنے والے احباب کے لیے "مختلف پیشوں کی اہمیت اور ان کی مناسب تقسیم" کے

عنوان سے ایک مقالہ کا اضافہ کر دیا گیا ہے جو موضوع اور مناسبت کے لحاظ سے قارئین کی مزید دلچسپی اور کتاب کی نافعیت وافادیت کا باعث ہوگا۔ انشاء اللہ

اس کتاب کے پڑھنے سے صرف یہ نہیں کہ علماء سلف کی عملی زندگی کی تصویر سامنے آ جائے گی بلکہ ان کے حالات میں اور ان کی تاریخی شخصیتوں کے حیرت انگیز واقعات میں اتنی تاثیر ہے کہ پڑھنے والے کے اندر عمل کا جذبہ ابھرتا ہے۔ یقین و توکل، آخرت کی کامیابی کی آرزو، خدا تعالیٰ سے محبت کے واقعات پڑھ کر خدا کے دین سے محبت اور آخرت کا یقین پیدا ہونے لگتا ہے، ان کی جرأت حق گوئی اور احیاء سنت کے جذبہ و شوق سے مایوس کن حالات میں کچھ کرنے کا شوق اور ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ ان کی عبادت اور تقویٰ کے قصے پڑھ کر دل میں عبادت اور تقویٰ کا جوش ابھرتا ہے۔ خدا کرے کہ یہ کتاب نسلِ نو کے لیے واقعتہً دینی و علمی اور اخلاقی انقلاب کی انگیخت کا ذریعہ بن سکے۔ آمین

اور آخری گذارش اپنے ناظرین باتمکین سے یہ ہے کہ اس دور میں علماء اور اربابِ دانش کی طرح عام مسلمانوں کو بھی اپنے مذہب سے شغف ہے، اپنے اکابر رجال پر فخر ہے، اپنے اسلافِ کرام پر ناز ہے، اپنے بزرگوں کے کارنامے سنکر اور پڑھ کر وہ وجد میں آجاتے ہیں۔ گو اس کی ضرورت واہمیت سے انکار نہیں مگر جذبات سے ہٹ کر عمل کی دنیا میں بحیثیتِ مجموعی ہمارے پاس فخر و مباہات اور ناز و افتخار کی یہ نمائش محض قول کی دنیا تک محدود ہے۔ عمل کا میدان یکسر خالی ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان جب تک عمل کی کڑیاں نہ ملائی جائیں تو مستحکم رابطہ ہرگز قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ اپنی ہیچمدانی اور علمی و عملی بے بضاعتی کے ہزار اعتراف کے ساتھ بارگاہِ ربوبیت میں دست بدعا ہوں کہ وہ اس ناچیز کوشش کو کامیاب فرماوے۔ لوگ امت کے ان جلیل القدر انسانوں کی سیرت، شخصیت، کردار اور خصائص سے واقف ہوں اور انہیں اپنانے کی کوشش کریں اور عملی تسلسل میں استحکام ہو۔

میرے قافلے میں لٹا دے اسے　　　لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

عبدالقیوم حقانی عفی عنہ

رفیق مؤتمر المصنفین واستاذ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

علامہ عبدالکریم سمعانیؒ اور کتاب الانساب

کا

اجمالی تذکرہ اور تعارف

تاج الاسلام امام عبدالکریم سمعانیؒ، ابوبکر محمد سمعانیؒ کے بیٹے تھے، بہت سے علماء اور ائمہ سلف کی طرح جنہوں نے اپنی زندگیاں علوم کے مطالعہ و تحقیق اور ان کی ترتیب و تدوین میں صرف کی تھیں اور اپنی سرگذشت، سوانح اور اپنی مساعی کی حفاظت کی طرف کوئی توجہ نہ کر سکے! امام سمعانیؒ بھی اپنے بعد آنے والے سوانح نگاروں کے لیے کچھ زیادہ سوانحی مواد نہ چھوڑ سکے۔ ابن اثیرؒ، ذہبیؒ ابن خلکانؒ اور سبکیؒ کی کتابوں میں ہمیں قدرے مختلف مواد ملتا ہے۔ ان کی کتابوں میں امام سمعانیؒ یا ان کے دوستوں کے بارے میں حوالوں کی صورت میں کچھ سوانحی نقوش مل جاتے ہیں۔ خود امام سمعانیؒ نے اپنی تصانیف میں اپنے آباؤ اجداد اور ان کے تعلقات کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں وہ بے حد اجمالی اور مختصر ہونے کے باوجود صحیح ہیں۔ ان کے خاندانی نسب ناموں اور شجرۂ نسب کی بناء پر یہ تعارفی مقدمہ مرتب کیا جا رہا ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ علامہ موصوف کا خاندان کافی عرصے سے مرو میں مقیم تھا جہاں اُن کے دادا محمد بن عبدالجبار سمعانیؒ قاضی تھے۔ موصوف قبیلہ سمعان جو قبیلہ تمیم کی ایک شاخ ہے کی طرف منسوب ہیں، ان کے حقیقی دادا ابوالمظفر منصور متوفی ۴۸۹ھ قرآنِ کریم کے مشہور مفسر اور صاحبِ علم و فضل بزرگ تھے، عظیم محدث بھی تھے۔ ان کے

کافی لائق اور باکمال تلامذہ کا تذکرہ یاقوت کی معجم البلدان میں ملتا ہے۔ انہوں نے ۴۶۲ھ میں مکۃ المکرمہ (زاد ہا اللہ شرفاً) میں حنفی مسلک ترک کر کے شافعی مسلک اختیار کر لیا تو ان کی اتباع میں ان کے بیٹے اور پوتے امام عبدالکریم سمعانیؒ بھی مسلکاً شافعی رہے، خود ہمارے مصنف مسلک شافعی کے بہت بڑے فقیہ اور امام تھے۔

امام سمعانیؒ کے والد صاحب ابوبکر محمد سمعانیؒ متوفی ۵۱۰ھ نے بہت سے علمی کام شروع کیے تھے لیکن انہیں اختتام تک نہ پہنچا سکے۔ امام سمعانیؒ جن کی کنیت ابو سعد یا ابو سعید تھی، ۵۰۶ھ میں مرو میں پیدا ہوئے اور ۵۶۲ھ میں انتقال فرمایا۔ جب ۹ سال کے ہوئے تو ان کے سرپرست انہیں حدیث پڑھانے کی غرض سے نیشاپور لے گئے۔ وہاں شیخ عبدالغفار بن محمدؒ جس نے ان کے دادا کے ہمعصروں کو پڑھایا تھا، کی خدمت میں کسب فیض اور تحصیلِ حدیث کے لیے پیش کر دیا، اگلے سال ان کی مرو واپسی ہوئی جہاں ان کے والد صاحب انتقال کر گئے تو امام سمعانیؒ کی پرورش اور تربیت ان کے چچا اور ان کے والد کے ایک دوست محمد الشجائیؒ (جو نرس کے رہنے والے تھے) نے کی جو امام سمعانیؒ کے لیے گویا حقیقی باپ ثابت ہوئے۔ امام سمعانیؒ نے جن لوگوں سے کسب فیض اور استفادہ کیا اُن کی تعداد چار ہزار سے سات ہزار تک بتائی جاتی ہے اور اس شرف میں کوئی دوسرا ان کا ہمسر نہیں۔
ان کی زندگی کا زیادہ تر حصہ حدیث سُننے اور دیگر معلومات جمع کرنے کے لیے سفروں میں گذرا، ۵۲۹ھ میں موصوف اپنے عم محترم کے ہمراہ نیشاپور پہنچے، ان کے چچا ابوالقاسم احمدؒ مرو واپس آ گئے مگر خود امام سمعانیؒ ایک سال تک نیشاپور میں مقیم رہے بعد میں اصفہان چلے گئے ۵۳۰ھ سے ۵۳۶ھ تک موصوف بغداد میں مقیم رہے، اس دوران علامہ کئی دوسرے شہروں میں بھی جاتے رہے، ۵۳۵ھ میں دمشق گئے، ۵۳۷ھ میں رائے گئے، اسی سال نیشاپور بھی گئے، ۵۳۸ھ میں طوس گئے۔ علامہ ذہبیؒ کے بقول امام سمعانیؒ ۵۳۸ھ میں مرو واپس آ گئے یہاں شادی کی، اگلے سال اُن کا لڑکا عبدالرحیم پیدا ہوا، جب سنِ شعور کو پہنچا تو امام سمعانیؒ نے اُسے مستقلاً اپنا رفیقِ سفر بنا لیا۔ لکھا ہے کہ عبدالرحیم سمعانیؒ نے بخارا میں درس حدیث کی سماعت کی۔ امام سمعانیؒ پھر دوبارہ انہی شہروں میں گھومتے رہے ۵۴۷ھ سے قبل صرف نیشاپور

چار مرتبہ تشریف لے گئے، دو مرتبہ طوس گئے ۵۴۹ھ میں وہ خوارزم میں تھے ۵۵۰ھ میں نسف گئے۔ بقول ذہبیؒ کے اسی سال وہ مرو واپس آ گئے ۵۵۱ھ میں اصفہان گئے ۵۵۰ھ میں سنجر اور غز کے مابین مصالحت میں مصروف رہے۔ غز کے لوگوں نے مرو کے قریب سنجر کے قلعے کا محاصرہ کر لیا تھا۔ "الانساب" میں یہ آخری تاریخ مذکور ہے۔

مندرجہ بالا تفصیلات میں ان تمام مقامات کا احاطہ نہیں کیا جا سکا۔ جہاں جہاں امام سمعانیؒ تشریف لے گئے۔ شام میں وہ سعیدہ اور حلب تک پہنچے ہیں۔ کچھ عرصہ کوفہ، بصرہ اور حجاز میں بھی رہے ہیں۔ جہاں انہوں نے ایک گھنٹے کا قیام کیا ہے وہاں بھی انہوں نے معلومات جمع کی ہیں اور بعض اوقات مطلوبہ معلومات کے حصول میں انہیں سخت مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا اور کئی کئی روز تک ایک جگہ پر حصولِ معلومات کی غرض سے قیام پذیر رہے۔

امام سمعانیؒ نے ۵۵۱ھ کے بعد مرو میں مستقل سکونت اختیار کر لی جہاں عمیدیہ کالج کے مدیر (پرنسپل) رہے، جیسا کہ یاقوت نے لکھا ہے یہاں انہوں نے زیادہ وقت اپنی جمع کردہ معلومات کو مرتب کرنے میں گذارا اور اپنی تصانیف کو منظم کرنے لگے۔ امام سمعانیؒ کے رفیق ابن عساکرؒ کی طرح امام سمعانیؒ کا مفصل تذکرہ مؤرخین نے نہیں کیا، ان کی تصانیف کی تعداد مؤرخین نے ۴۹ تک گنوائی ہے۔

امام سمعانیؒ کی تصانیف کی تین نقلیں ہمیں سبکیؒ کی تصانیف اور علامہ ذہبیؒ کی قلمی اور چھپی ہوئی تصانیف میں ملتی ہیں جہاں آپ کی تصنیفات کے عنوانات کی فہرست صحیح موازنہ کے بعد محفوظ کر لی گئی ہے، بعض مستشرقین نے بھی "کشف الظنون" سے آپ کی بیس تصنیفات کے نام نقل کیے ہیں۔ آپ کی بعض کتابوں کے تراجم لاطینی زبان میں بھی کیے گئے ہیں۔ خود "الانساب" میں آپ کی تین تصنیفات کا اشارہ ملتا ہے مگر امام سمعانیؒ کی ادبی تصنیفات مرو سے باہر نہ نکل سکیں جو آپ کی خاندانی لائبریری سمعانیہ میں محفوظ کر لی گئی تھیں جن کا حوالہ یاقوت نے دیا ہے مگر جب منگولوں کا حملہ ہوا اور شہر کو جلا دیا گیا تو ۶۱۸ھ میں یہ قیمتی علمی سرمایہ بھی ضائع ہو گیا ـــــ الانساب میں وہی مواد جمع کیا گیا ہے جو مصنف کی کتاب معجم الشیوخ وفیات المتاخرین من الرواۃ معجم البلدان، ضمیمہ تاریخ البغداد اور تاریخ مرو میں لکھا ہوا ہے

گویا آپ نے یاقوتؒ کی معجم البلدان اور ابن عساکرؒ کی تاریخ دمشق کی طرح تمام علوم اس میں سمو دیئے ہیں۔ آپ کی یہ کتاب معلومات کا ایک قیمتی خزانہ ہے۔ یاقوتؒ کی تصنیف کی طرح الانساب کا مطالعہ بھی عرب علماء محققین اور ریسرچ و تحقیق کے اداروں کے لیے ایسا ہے کہ اس کے بغیر وہ اپنا کام نامکمل سمجھتے ہیں۔

کتابُ الانساب

علم الانساب عربوں کا ایجاد کردہ ہے، اصل اور جڑ جس کی تعبیر عرب "نسب" سے کرتے ہیں۔ دیگر سامی زبانوں میں اس کی مثال نہیں ملتی ممکن ہے کہ اس کا تعلق لفظ "سبب" (رسی) سے ہو جس کا عام مفہوم وابستگی اور تعلق ہے۔ قرآن حکیم میں بھی اس کا ہم معنی کلمہ "صہر" ملتا ہے جس کا معنی وہ رشتہ ہے جو شادی سے قائم ہو جو والدین کے تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ گویا انساب کا تعلق بھی بنیادی طور پر اس قسم کے رشتہ کو ظاہر کرتا ہے جو ماں باپ کے ذریعہ قائم ہو، مگر مستقل "فن" بن جانے کے بعد اس میں عموم آگیا، قبائل اور پیشوں کی نسبتوں کا اظہار بھی اسی سے ہونے لگا۔

علم الانساب نے زمانۂ اسلام میں اور خصوصاً اموی دور میں خوب ترقی کی، عربوں کے زوال کے بعد بھی اس علم کا مطالعہ اور ریسرچ و تحقیق جاری رہی حتیٰ کہ ہندوستان اور ترکی میں بھی لوگ اپنے آپ کو عربوں سے منسوب کرتے رہے۔

وہ توصیفی شکل جو قبائلی تعلق کو ظاہر کرتی ہے اور یہ سامی زبانوں کے علاوہ قدیم یورپی زبانوں میں ملتی ہے۔ لاطینی اور یونانی زبانوں میں بھی اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ یہ توصیفی شکل جسے بعد کے علماء نحو نے نسب یا نسبت کی اصطلاح قرار دیا ہے، نہ صرف قبائلی تعلق کو ظاہر کرتی ہے بلکہ اس سے مقامات اماکن اور پیشوں کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اس قسم کی توصیفی شکلیں ایک ہوں یا زیادہ ہر آدمی استعمال کر سکتا ہے کہ اس سے معرفت اور پہچان میں سہولت رہتی ہے۔ صحاح ستہ کے تین مشہور محدثین امام بخاریؒ، امام ترمذیؒ اور امام نسائیؒ انہی خصوصی نسبتوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ عربوں میں مصنفین کا یہی طریقہ مروج ہے۔ جب ایسی نسبتوں کی تعداد بڑھ گئی، تعارف اور پہچان میں اشتباہ ہونے لگا تو انہیں جمع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، اشتباہ سے بچنے اور توضیح کے طور پر حقیقت مصداق کو پانے کے لیے کچھ حالات

بھی لکھے گئے۔

علم اسماء الرجال میں مسلمانوں نے جوش وجذبے سے دلچسپی لی، پھر حضرات محدثین کے ذریعہ ہمیں جو ذخیرہ حدیث پہنچا ان کی شخصیتوں اور انساب کے تعارف پر معجم ابن قیصرانی علامہ سمعانیؒ کے لیے ایک پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اس کتاب کے صرف پچاس سال بعد عرب علماء کے سامنے اس سلسلہ میں علامہ عبدالکریم سمعانیؒ نے ایک جامع اور نادر کتاب پیش کی جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ مشہور مؤرخ ابن اثیرؒ نے اس کی تلخیص کی جس کی دو جلدیں برلن کی شاہی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ اس کی دوبارہ تلخیص امام جلال الدین سیوطیؒ نے کی جو زیور طباعت سے آراستہ بھی ہوئی۔ علامہ سمعانیؒ کی اصل کتاب کے حوالے ہمیں ابن اثیرؒ اور ذہبیؒ کی تاریخوں کے علاوہ ابن خلکانؒ اور سبکیؒ کی معاجم میں بھی ملتے ہیں۔ اصل کتاب تو آٹھ مجلدات میں ہے پھر وہ تلخیص در تلخیص کی وجہ سے مختصر ہوتی گئی اور اس کی تین جلدیں باقی رہ گئیں اور اب اس سے بھی مختصر نسخہ صرف ایک جلد میں دستیاب ہے جو ایک ہزار چھ (۱۰۰۶) صفحات پر مشتمل ہے ہمارے پاس بھی یہی نسخہ ہے جو قلمی طرزِ خطی کی فوٹو لے کر عمدہ کاغذ پر بیروت میں طبع کرایا گیا ہے۔ قارئین کی ضیافتِ طبع کے لیے اس کے ایک صفحہ کا عکس بھی اس کتاب میں شریکِ اشاعت کر دیا گیا ہے۔

کتاب الانساب کا صفحۂ آغاز

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله الذي فتح أبواب الرغائب ومنح أسباب المواهب زين الدنيا بمتاعها ثم زهد فيها بانقطاعها فلا قرار منه لخائف ولا محيص عنه لعارف نحمده ونأمله تأميلا ونسأله ونتخذه وكيلا ولا نبتغي عن طاعته تحويلا ولا نهتدي إلى غيره سبيلا ونصلي على محمد عبده ورسوله المبعوث وغصن الدين يابس ورسم اليقين دارس فصدع بعمود الدين فحصحص الحق ووجه اليقين أزهر ناضر صلى الله عليه وعلى آله وأصحابه الذين ازداد بهم الحق إشراقا والدين انتظاما واتساقا وسلم تسليما كثيرا أما بعد فإن الله عز وجل اختار محمدا صلى الله عليه وسلم من عباده واختصه لنفسه من بلاده فبعثه إلى الخليقة بشيرا ومن النار لمن زاغ عن سبيله نذيرا يدعو الخلق من عبادة عباده إلى عبادته ومن اتباع الشيطان إلى أمره وطاعته ثم لم يجعل الفزع عند كل حادثة ولا المهرب عند وجود كل نازلة إلا إلى النبي صلى الله عليه وسلم فسنته الفاصلة بين المتنازعين وآثاره القاطعة بين الخصمين وشرف شريعته وعظمها ورفع خطرها على ما سواها المدارك وكرمها وقيض لها من الحفظة والوعاة رجالا من النقلة والرواة طائفة أذهبوا في تقييد شواردها أعمارهم وفي نظم قلائدها أفكارهم أخبرنا أبو محمد يحيى بن علي المدير وأبو الحسن محمد بن أحمد الدقاق ببغداد قالا أنا أبو بكر أحمد بن علي بن ثابت الخطيب إجازة أنا أبو بكر أحمد بن علي بن ثابت الخطيب إجازة أنا أبو سعيد إسماعيل بن علي بن الحسن بن بندار المثنى الأستراباذي ببيت المقدس نا محمد بن عبد الله الحافظ نا أبو الوليد حسان بن محمد قال لقد جمع من أهل العلم لأبي العباس بن سريج أنشدنا القاضي قال إن الله بعث عمر بن عبد العزيز على رأس المائة فأظهر كل سنة وأمات كل بدعة ومن الله تعالى على رأس المائتين بالشافعي حتى أظهر السنة وأخفى البدعة ومن الله علينا على رأس الثلاثمائة بك حتى قويت كل سنة وضعفت كل بدعة وقد قيل في ذلك شعر اثنان قد مضيا فبورك فيهما عمر الخليفة ثم حلف السودد والشافعي الألمعي لم يتحرر البر ابن عم محمد أبشر أبا العباس أنك ثالث من بعدهم سقيا لتربة أحمد فخلصت منهم الفائدة وتورثت لديهم الحمد وكملت بهم النعمة وترادفت عليهم المنة ونال الله أنواع الشكر على ما خصنا به وأداء الشكر فيما أحل الله وهو حسبنا ونعم الوكيل وكان علم المعارف والأنساب بخدمة الأمة من أهم العلم التي وضعها الله سبحانه وتعالى فيهم على ما قال الله تعالى يا أيها الناس إنا خلقناكم من ذكر وأنثى وجعلناكم شعوبا وقبائل لتعارفوا إن أكرمكم عند الله أتقاكم حدثنا أبو عبد الله محمد بن الفضل الفراوي وأبو محمد إسماعيل بن أبي سهل السدي وأبو محمد إسماعيل بن عبد الرحمن القارئ وأم الخير فاطمة بنت علي بن المظفر بن زعبل بن عجلان البغدادي قراءة عليهم بنيسابور قالوا أنا أبو الحسين عبد الغافر بن محمد بن عبد الغافر الفارسي أنا أبو العباس إسماعيل بن عبد الله الميكالي أنا عبدان بن أحمد بن موسى الأهوازي ثنا زيد بن الحريش ثنا أبو همام عن موسى بن عبيدة عن عبد الله بن دينار عن ابن عمر رضي الله عنهما أن رسول الله صلى الله عليه وسلم طاف يوم فتح مكة على ناقته القصواء يستلم الأركان بمحجنه فلما خرج لم يجد مناخا فنزل على أيدي الرجال ثم خرج بها إلى بطن الوادي فأناخها ثم خطب الناس على راحلته فحمد الله وأثنى عليه ثم قال أما بعد فإن الله عز وجل قد أذهب عنكم عبية الجاهلية

فضیلتِ عمل

کسبِ معاش اور پیشۂ رزقِ حلال

قرآنی ہدایات اور اسلامی تعلیمات کو ابتداء سے انتہا تک پڑھتے چلے جائیے آپ کے یقین میں بھی اضافہ ہوتا چلا جائے گا کہ دنیا اور آخرت میں کسی ایک معاملہ کا انحصار محض عقیدہ اور محض ایمان پر نہیں رکھا گیا ہے۔ قرآنِ کریم میں جگہ جگہ امنوا کے ساتھ ساتھ عملوا الصّٰلحٰت کی قید بھی لگی ہوئی ہے

عقیدہ اور عملِ صالح کا تلازم لاریب ایمان و عقیدہ خشتِ اول ہے مگر عملِ صالح کے بغیر تعمیر بھی ناممکن ہے۔ قرآن و حدیث میں نتائج و ثمرات اور جزاء و سزا کا سارا دارومدار عمل اور کسب پر رکھا گیا ہے، اور یہ کوئی ایسی بات نہیں جسے اپنے موضوع کے ثبوت کے لیے گھڑا جا رہا ہے (معاذ اللہ) قرآن کریم آپ کے سامنے ہے۔ اکتساب کے مساعی پر ثمرات کا ترتب قرآنی نصوص کا واضح اور مبنی بر حقیقت اور واشگاف اعلان ہے:۔

لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ (سورۃ نجم آیت ۳۹)	انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔

یعنی نیکی ہو یا بدی، خیر ہو یا شر، عزت ہو یا ذلت، علمی کمال ہو یا جہالت، کامیابی ہو یا ناکامی سب کچھ انسان کی اپنی سعی و کوشش کا نتیجہ ہے۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ کوشش اور مساعی کا انداز غلط ہو، سمتِ تبلہ غلط ہو اور نتیجہ مفید اور درست نکلے۔ اور یہ بھی سراسر نادرست ہی ہے کہ سعی اور کوشش تو بالکل ہی نہ ہو اور ثمرہ کا ترتب اپنی

خواہش کے مطابق ہو۔

سعی پر ثمرات کا ترتب دنیا اور آخرت دونوں میں ہوگا

بعض دوستوں نے نادانی سے اس قاعدہ کو جزئیہ بنا کر آخرت کے ساتھ خاص کر رکھا ہے حالانکہ ایسا ہرگز نہیں۔ یہ قاعدہ کلیہ ہے اس کو صرف آخرت کے ساتھ وابستہ کر کے رکھ دینا ہرگز صحیح نہیں۔ دنیا کی زندگی میں بھی اسی اصول کی کارفرمائی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ دنیا کی زندگی آخرت کی زندگی سے کوئی الگ شے نہیں۔ انسانی حیات تو ایک جوئے رواں ہے اور دنیوی زندگی اس کا ایک مختصر سا حصہ ہے۔

بہر حال بتانا یہ ہے کہ دنیا دین سے کوئی علیحدہ چیز نہیں ہے۔ دُنیا آخرت کا پیش خیمہ اور نبوت کے الفاظ میں آخرت کی کھیتی ہے اور جب اس دُنیا میں مخلوق اپنے خالق کی مرضی کے مطابق زندگی گذارے تو اس کا نام دین ہے۔ قرآنی نصوص اور تعلیماتِ نبویہ میں اس امر کو واضح کر دیا گیا ہے کہ اسی دنیا کے اعمال ارتقا یافتہ شکل میں نتائج اور ثمرات بن کر آخرت میں ہر ایک کے سامنے آجائیں گے۔ لہٰذا سعی وعمل اور کوشش و اکتساب اور کسب وفعل کے مذکورہ قرآنی فرمان کو جن لوگوں نے صرف آخرت کے ساتھ وابستہ کر کے رکھ دیا ہے، وہ سراسر غلطی اور جہالت پر ہیں۔ بلکہ اس دنیائے فانی میں مذکورہ اصول اور قرآنی کلیہ کار فرما ہے کہ جو شخص بھی جتنی اور جیسی کوشش کرے گا دُنیا میں اس کے مطابق پھل پائے گا۔

کسب و مساعی کی وسعت اور عموم

اور اگر اس پر مزید فکر و تدبر اور غور سے کام لیا جائے تو یہ حقیقت بھی اُبھر اُبھر کر سامنے آجاتی ہے کہ یہ قرآنی اصول محض انفرادی قاعدہ بھی نہیں بلکہ پوری امت کی اجتماعی اور جماعتی زندگی میں اسی اصول کی حکمرانی ہے۔ انفرادی زندگی اور فرد کے مساعی پر نتائج وثمرات کے ترتب کو قرآنِ حکیم نے یوں بیان فرمایا ہے :۔

لہا ما کسبت و علیہا ما اکتسبت۔ (سورۃ البقرہ آیت ۲۸۶)	ہر شخص کے اچھے اور بُرے نتائج اسکے کسب وعمل کے مطابق ہوں گے۔

اور اجتماعی شکل کو یوں واضح فرمایا:۔

لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ (سورۃ البقرہ آیت ۱۴۱) | تمہارے کسب ہی کے مطابق تمہیں مفاد حاصل ہوگا۔

کسب وسعی میں صرف نماز، روزہ اور حج وزکوٰۃ داخل نہیں صرف ذکر وفکر اور مراقبہ وشب بیداری داخل نہیں بلکہ کسبِ معاش اور حصولِ رزق اور اس سلسلہ کے انفرادی واجتماعی جتنے بھی طریقے ہیں سب سعی اور کسب میں داخل ہیں جس طرح روزہ اور نماز عبادت ہے اسی طرح رزقِ حلال کی کمائی اور کسبِ معاش بھی عبادت ہے۔

انسانی اور اخلاقی قدروں میں تبدیلی کا فتنہ

مگر موجودہ دور میں ہزار ہا دیگر فتنوں کی طرح ایک مشکل یہ بھی بن آئی ہے اور ایک فتنہ یہ بھی پیدا کیا جا چکا ہے کہ معاشرتی سطح پر بہت سی انسانی واخلاقی قدریں تبدیل کر دی گئی ہیں بلکہ اُلٹ دی گئی ہیں۔ جس کی وجہ سے عزت، ذلت اور ذلت عزت بن گئی ہے۔ عیب، ہُنر اور ہُنر، عیب ہو گیا ہے، اور وہ بھی یہاں تک کہ اگر ایک شخص بیکار بیٹھ جاتا ہے، محنت سے جی چراتا ہے اور کاسۂ گدائی لے کر دوسروں کی کمائی پر پڑا رہتا ہے تو لوگ اسے متوکل کا لقب دینے لگتے ہیں مگر حقیقت یہ نہیں بلکہ اس قسم کی بیکاری، بے عملی، بدعملی اور ترکِ سعی وکوشش کا نام توکل نہیں۔

توکل کی تعریف

توکل تو خدا کی ذات پر بھروسہ اور اعتماد کر کے، اس سے خیر کے نتائج وثمرات کے ترتب کی اُمید اور یقین کر کے مسلسل کام کرنے کو کہتے ہیں۔ یعنی ایک طرف تو مسلسل سعی ہو، انتھک کوشش ہو، مقدور بھر جدّوجہد ہو، دوسری جانب خیر کی اُمید اور نیک ثمرات کی توقع کے ساتھ نتائج کو خدا تعالیٰ کے فضل وکرم پر چھوڑ دیا جائے۔ کسب ومساعی اور رزقِ حلال کی کمائی سے مُنہ موڑ کر دوسروں کے چندوں، نذرانوں اور عطایا اور ھدایا پر زندگی گذارنا ہرگز توکل نہیں۔ یہ فقر وتصوف کا سراسر غلط استعمال ہے، یہ توکل نہیں بلکہ فریبِ نفس ہے اور شیطان کے مکر وفریب کی ایک خطرناک چال ہے۔

ے خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلمان بنا کے تقدیر کا بہانہ

بعض پیشوں کا احترام اور بعض تذلیل اور حقارت کے کام

اسی طرح اخلاقی اقدار الٹ گئیں تو ذہنیت بدل گئی خیر و شر اور نیکی و بدی کے پیمانے بدل گئے۔ اپنی معاشرتی سوسائٹی پر نظر کیجیے، آپ کے ماحول میں اور آپ کی مسلمان سوسائٹی میں بھی بعض پیشوں کو معزز اور بعض کو حقیر فرض کر لیا گیا ہے۔ دراصل یہی وہ غلط تاثر ہے جس میں بڑے بڑے سنجیدہ لوگ بھی غلطاں ہو کر رہ گئے ہیں علماء اور فضلاء کے ہاں بھی اپنے کسبِ معاش کے سلسلہ میں پیٹ پر پتھر باندھ لینے کو بعض پیشوں کے اختیار کرنے پر ترجیح دی جا رہی ہے۔ اہلِ علم کے لیے ذریعۂ معاش کیا ہو؟

دینی خدمات پیشہ نہیں

یہ ایک اہم سوال ہے، اس کے لیے تو ان کے طبعی فطری مزاج اور ذوق کو ترجیح اور فوقیت دی جائے گی، مگر کیا امامت، خطابت، تدریس، تبلیغ، تصنیف و تالیف اور ریسرچ و تحقیق معزز پیشے ہیں؟ ایسا ہرگز نہیں! یہ معزز مقام تو ہے، منصب ہے، مگر یہ کام پیشہ نہیں فریضۂ منصبی ہے۔
اسے معزز پیشہ سمجھ کر، محنت مزدوری، دستکاری، تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت و زرگری وغیرہ کے پیشوں کو حقیر سمجھ کر کسبِ معاش اور رزقِ حلال کی کمائی کو اپنے لیے حقارت و ذلت تصور کرنا ہرگز انسانی اقدار کے موافق نہیں بلکہ یہ رُوحِ اسلام کی مخالفت اور اسلامی ہدایات و تعلیمات سے بغاوت ہے۔

ذلت کا ایک پیشہ

دُنیا کا کوئی پیشہ حقیر و ذلیل نہیں، ذلیل پیشہ دنیا میں صرف اور صرف ایک ہے اور وہ ہے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا یا ہاتھ پھیلائے بغیر اپنی ہیئت اور شکل و صورت اور وضع قطع کے لحاظ سے دوسروں کے سامنے سوالیہ نشان بنے رہنا۔
امامت، خطابت، تدریس، تصنیف و تالیف، تبلیغ اور خدمتِ دین اور طریقت و ارشاد کوئی پیشہ نہیں بلکہ دینی اور تنظیمی ضرورت ہے۔ اگر ایک مدرس، ایک خطیب، ایک مصنف

ایک محقق، ایک مبلغ یا پیرِ طریقت، کسبِ معاش اور رزقِ حلال کے لیے کوئی پیشہ اختیار کرے تو اُس کو ہنر اور پیشہ اختیار کرنے کی وجہ سے پہلے سے زیادہ معزز سمجھنا چاہیئے۔ مگر اب جبکہ ایک خاص منصوبہ بندی سے اسلامی اقدار کو مسخ کیا جا رہا ہے، اخلاقی قدریں تباہ کر دی گئی ہیں، اس قسم کی ہنر مندیوں اور پیشوں میں کمالات و اختصاصات کو عیب تصور کیا جانے لگا ہے، اور یہ قومی و ملی سطح پر اہلِ اسلام کے لیے ایک بہت بڑا المیہ ہے۔

قرآنی آیات اور صنعت و حرفت کی اہمیت

انسانی تمدن کو جن صنعتوں اور ہُنر مندیوں کی ضرورت ہے اُن میں سے بعض کا ذکر قرآنِ حکیم میں کیا گیا ہے۔ دنیا میں سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی بنائی تھی اور جس کے بنانے میں سالہا سال صرف ہوئے تھے، اور کشتی کی تشکیل و صنعت کی تکمیل آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کی تھی تاکہ مومنوں کو طوفانِ نوحؑ سے بچایا جا سکے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے:۔

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا۔ (سورہ ہود آیت ۳۷)	اور ہماری نگرانی میں کشتی بنائیے اور ہمارے حکم سے۔

یہ کشتی ایک بڑا جہاز تھا جس میں الگ الگ درجے اور مختلف احاطے تھے حیوانات کے جوڑوں یعنی نر اور مادہ کے لیے الگ احاطہ تھا اور کم و بیش اسّی مسلمانوں کے لیے الگ احاطہ قائم کر دیا گیا تھا۔ قرآنِ حکیم کی اس شہادت سے معلوم ہوا کہ حضرت نوح علیہ السلام کو بذریعہ وحی بڑھئی کا کام سکھلایا گیا اور اس پیشہ کی تکمیل و اختصاص کی خصوصی تعلیم دی گئی۔ پھر آپ نے کشتی کے بنانے میں اپنے اس فن کا خوب خوب مظاہرہ کیا، اور یہ کام بڑی خوبی اور تدبیر و احتیاط کے ساتھ سر انجام دیا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو زرہ سازی کی صنعت کی تعلیم دی گئی

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت داؤد علیہ السلام کو زرہیں بنانے کے صنعت اور اس پیشہ کی ضرورت و اہمیت بذریعہ وحی تعلیم کر دی گئی مقصد یہ تھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی وساطت سے یہ صنعت

مومنوں میں ترویج پائے گی تو وہ جنگ کے حالات میں دشمن کی فوج کے حرب وضرب سے مسلمان سپاہیوں کی حفاظت اور دفاع کا کام لیں گے۔ چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ۝ (سورۃ الانبیاء آیت ۸۰)

یعنی ہم نے داؤد علیہ السلام کو زرہیں بنانے کی صنعت سکھائی تھی تاکہ بچاؤ ہو تم کو تمہاری لڑائی میں، سو کیا تم شکر کرتے ہو۔

قرآنی شہادت منصوصی طور پر آپ کے سامنے ہے جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ باری تعالیٰ کی طرف سے خصوصیت کے ساتھ اپنے برگزیدہ پیغمبر حضرت داؤد علیہ السلام کو لوہاروں کا کام سکھایا گیا تھا۔ اس صنعت کو اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے ذریعہ دُنیا میں ترویج دی۔ حق تعالیٰ نے ان کے ہاتھ میں لوہا نرم کر دیا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام تعلیمِ وحی کے مطابق اسے موڑ کر نہایت ہلکی، مضبوط و مربوط اور اس زمانہ کے اعتبار سے جدید قسم کی عمدہ زرہیں تیار کر لیتے تھے جو لڑائی میں حفاظت اور دفاع کا خوب کام دیتی تھیں۔

احادیثِ نبوی کی روشنی میں کسبِ معاش کی فضیلت و اہمیت

اسی طرح احادیثِ نبوی میں بھی رزقِ حلال کی کمائی، کسبِ معاش اور صنعت و حرفت کی بڑی فضیلت اور اہمیت بیان کی گئی ہے اس سلسلہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات پیشِ خدمت ہیں۔ حضرت مقدام بن معد یکرب نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشادِ گرامی یوں بیان فرمایا ہے:۔

مَا اَكَلَ اَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِّنْ اَنْ يَّاْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ وَاِنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ دَاوُدَ يَاْكُلُ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ۔ (رواہ البخاری)

جو کھانا انسان اپنے ہاتھوں سے کام کر کے کمائے اور کھائے اس سے بہتر کوئی کھانا نہیں ہے، اور اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھوں کی کمائی سے کھاتے تھے۔

اس حدیث میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دستکاری، صنعت وحرفت اور محنت ومزدوری، رزقِ حلال اور کسبِ معاش کی فضیلت کو بیان فرمایا ہے۔ یعنی تحصیلِ معاش کی سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ آدمی اپنے ہاتھ سے ایسا کام کرے جس سے کھانے پینے کی ضرورتیں پوری ہوں اور یہ اللہ کے پیغمبر حضرت داؤد علیہ السلام کی سنّت ہے۔

بہترین اور پاکیزہ کھانا

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد یوں بیان فرمایا ہے:۔

اِنَّ اَطْیَبَ مَا اَکَلْتُمْ مِنْ کَسْبِکُمْ
(ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ ونسائی)

بہترین کھانا وہ ہے جو تم اپنے کسب سے کماؤ اور کھاؤ۔

یہی مضمون حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے یوں روایت کیا ہے:۔

قِیْلَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَیُّ الْکَسْبِ اَطْیَبُ قَالَ عَمَلُ الرَّجُلِ بِیَدِہٖ وَکُلُّ بَیْعٍ مَبْرُوْرٍ۔
(احمد بزار، طبرانی)

پوچھا گیا یا رسول اللہ! کون سا کسب سب سے زیادہ بہتر ہے؟ ارشاد فرمایا ایک تو اپنی محنت کی کمائی اور دوسری ہر قسم کی ایماندارانہ اور دیانتدارانہ تجارت۔

مطلب یہ ہے کہ سب سے اچھی کمائی تو وہی ہے جو خود اپنے دست وبازو اور اپنی محنت سے ہو، اور اُس تجارت کی کمائی بھی پاکیزہ ہے جو شریعت کے احکام کے مطابق اور دیانتداری کے ساتھ ہو۔ کُلُّ بَیْعٍ مَبْرُوْرٍ کا یہی مطلب ہے۔

صنعت کار سے خدا تعالیٰ کی محبّت کا اعلان

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُؤْمِنَ الْمُحْتَرِفَ
(الکبیر۔ الاوسط)

اللہ تعالےٰ حرفت والے مومن کو دوست رکھتا ہے۔

حدیث پاک میں محترف کا لفظ آیا ہے جو احتراف سے اسم فاعل ہے جس کا اصل مادہ حرفت ہے۔ لُغتِ عربی میں حرفت سے مراد پیشہ، کاروبار اور کسبِ معاش کا

شغل ہے۔اس لفظ میں ہر قسم کے پیشے داخل ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:۔

كَانَ زَكَرِيَّا نَجَّارًا۔ (مسلم)

حضرت زکریا علیہ السلام بڑھئی کا کام کرتے تھے۔

رزقِ حلال کمانے کی تھکاوٹ مغفرت کا ذریعہ ہے

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہما سے مروی ہے:۔

مَنْ أَمْسَىٰ كَالًّا مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ أَمْسَىٰ مَغْفُورًا لَهُ۔۔ (طبرانی)

جو دن بھر کی محنت کے بعد تھکا ماندہ رات گذار دے اس کی وہ رات مغفرت میں گذرے گی۔

باغبانی اور کاشتکاری کی فضیلت واہمیت

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کسبِ معاش کے متعلق ایک ارشادِ نبوی یوں نقل فرماتے ہیں:۔

مَا مِنْ مُؤْمِنٍ يَغْرِسُ غَرْسًا أَوْ يَزْرَعُ زَرْعًا فَيَأْكُلُ مِنْهُ طَيْرٌ أَوْ إِنْسَانٌ أَوْ بَهِيمَةٌ إِلَّا كَانَ لَهُ صَدَقَةٌ۔

(بخاری۔ مسلم، ترمذی)

جو کوئی صاحبِ ایمان بندہ درخت کا پودا لگائے یا زمین کاشت کرے پھر اس میں سے پرندے کھائیں یا آدمی یا کوئی جانور کھائے تو وہ اس کے حق میں صدقہ ہوگا۔

حدیثِ پاک میں باغبانی اور کاشتکاری کے لیے جن پر انسان کی بنیادی ضرورتوں کا دارو مدار ہے، کتنی بڑی ترغیب اور ہمت افزائی ہے۔

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے اسی مضمون پر مشتمل ایک ارشادِ نبوی منقول ہے:۔

النَّخْلُ وَالشَّجَرُ بَرَكَةٌ عَلَى

کھجور اور دوسرے درخت بونے والے

اَھْلِہٖ وَعَلٰی عَقِبِہِمْ بَعْدَھُمْ اِذَا کَانُوْا لِلّٰہِ شَاکِرِیْنَ۔ (طبرانی)

کے موجودہ اہل و عیال کے لیے بھی باعث خیر و برکت ہیں اور بعد میں آنے والی نسل کے لیے بھی بشرطیکہ وہ شکرِ الٰہی کرتے رہیں۔

دیانتدار تاجر کا مرتبہ و مقام

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے تجارت کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یوں منقول ہے :۔

اَلتَّاجِرُ الْاَمِیْنُ الصَّدُوْقُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَاءِ (ترمذی)

پوری سچائی اور ایمانداری کے ساتھ کاروبار کرنے والا تاجر نبیوں اور صدیقوں اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔

یعنی جو تاجر اپنی تجارتی مصلحت اور نفع و نقصان سے صرف نظر کر کے اللہ کے حکم کے مطابق ہر حال میں سچائی اور ایمانداری کی پابندی کرتا ہے وہ خدائی امتحان میں بڑا کامیاب ہے۔ اس حدیثِ پاک میں ایسے تاجروں کو بشارت سنائی گئی ہے جو قیامت اور آخرت میں اللہ تعالےٰ کے مقبول ترین بندوں یعنی نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ان کی سچائی اور دیانتداری کا صلہ ہوگا۔

کسبِ رزقِ حلال کی فرضیت

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

طَلَبُ کَسْبِ الْحَلَالِ فَرِیْضَۃٌ بَعْدَ الْفَرِیْضَۃِ ۔ (بیہقی)

رزقِ حلال حاصل کرنے کی فکر و کوشش فرض کے بعد فریضہ ہے۔

مقصد یہ ہے کہ ایمان و اسلام اور نماز روزہ اور بنیادی ارکان و فرائض کے بعد حلال روزی حاصل کرنے کی فکر اور کسبِ معاش کی کوشش بھی ایک اسلامی فریضہ ہے بندہ اگر اس سے غفلت برتے اور کوتاہی کرے تو خطرہ ہے کہ حرام روزی سے پیٹ بھرے اور آخرت میں اس کا انجام وہ ہوگا جو حرام سے پیٹ بھرنے والوں کا بتلایا گیا ہے۔

خدا اس پر رحمت کرے جو صنعت میں کمال پیدا کرے

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مسجدِ نبوی کے لیے کچی اینٹیں تیار کیں۔ حضرموت کا ایک شخص بڑی عمدگی سے مٹی گوندھ رہا تھا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کام دیکھ کر فرمایا۔

رَحِمَ اللّٰهُ اِمْرَأً حَسَّنَ صَنْعَتَهٗ وَقَالَ لَهٗ اَلْزِمْ اَنْتَ هٰذَا الشُّغْلَ فَاِنِّیْ اَرَاكَ تُحْسِنُهٗ۔ (ابن ماجہ)

خدا اس پر رحمت فرمائے جو کسی صنعت میں کمال پیدا کرے، پھر اس شخص سے فرمایا تم اسی کام میں لگے رہو کیونکہ مجھے نظر آتا ہے کہ تم اسے عمدگی سے کرتے ہو۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدور کے ہاتھوں کو بوسہ دیا

اسد الغابہ میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کیا تو اُن کی ہتھیلی کچھ کھردری اور داغدار نظر آئی، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا یہ داغ کیسے ہیں؟ عرض کیا یارسول اللہ! میں نعل بندی کا کام کرتا ہوں اور اسی سے اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتا ہوں یہ سُنکر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور ارشاد فرمایا۔

هٰذِهٖ يَدٌ لَا تَمَسُّهَا النَّارُ۔

یہ وہ ہاتھ ہے جسے آگ نہیں چھو سکتی۔

اللہ اللہ! کیا مقام اور کیا مرتبہ ہے کسبِ حلال کا۔ ہم دیکھتے ہیں، شب و روز کا ملاحظہ ہے کہ بیکار شیوخ اپنے مریدوں سے اپنے ہاتھ پاؤں کے بوسے دلواتے ہیں اور یہاں سید الاولین و الآخرین حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ایک اُمتی کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر اُسے آتشِ دوزخ سے محفوظ رہنے کی بشارت دیتے ہیں اور اس کا درجہ صرف اس لیے بلند فرماتے ہیں کہ وہ ہنرمند تھا اور اپنی صنعت و محنت سے حلال روزی کماتا تھا۔

کسبِ معاش کے جائز پیشے عین عبادت ہیں

خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء اور

صحابہ کرام کی زندگیاں اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ کسب حلال کے لیے پیشے صرف جائز ہی نہیں بلکہ ضروری بھی ہیں اور فقط ضروری ہی نہیں بلکہ عین عبادت بھی ہیں۔ اور سوسائٹی کی تشکیل اور معاشرہ کی تعمیر میں اشیاء کی خرید و فروخت، تجارتی معاملہ و مبادلہ اور محنت و مزدوری اور صنعت و زراعت اور قرض و عاریت وغیرہ معاشی معاملات اس دنیا میں انسانی زندگی کے لوازم ہیں۔

شعبۂ معاملات کے چار بنیادی اصول

پھر اس شعبۂ معاملات میں اسلامی احکام و تعلیمات کی بنیاد بھی چار اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ (۱) خلق اللہ کی نفع رسانی (۲) دوسرے عدل (۳) تیسرے سچائی و دیانت (۴) چوتھے سماحت یعنی ہر فریق دوسرے کے ساتھ رعایت اور خیر خواہی کا معاملہ کرے، خاص کر کمزور اور ضرورت مند فریق کو حتی الوسع سہولت دی جائے۔

صحابۂ کرامؓ اور کسبِ معاش

پھر حضرات صحابۂ کرامؓ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کو ملحوظ رکھ کر پوری دنیا کے سامنے عملی نمونے قائم فرمائے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اینٹیں تھاپنے اور رہٹ چلانے کا کام کیا ہے۔ اسی طرح حضرت عثمان ذوالنورینؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ وغیرہم تجارتی کاروبار کرتے رہے، اور یہ سب حضرات عشرہ مبشرہ سے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مندرجہ بالا آیات اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں صنعت و حرفت دستکاری، کھیتی، شجرکاری، تجارت و کسب معاش اور مزدوری کے تمام جائز ذرائع اور پیشوں کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے اور انہی ذرائع کو نبوت کی تعلیمات میں پاکیزہ، خدا کا پسندیدہ، ذریعہ مغفرت، صدقہ، باعث خیر و برکت اور پھر انبیاء و صدیقین اور شہداء کی رفاقت کا سبب بتایا گیا ہے۔

الغرض کسب معاش کے لیے جو پیشے اور ذرائع استعمال کیے جائیں بشرطیکہ وہ حلال اور شرعاً جائز ہوں اور حرام طریقوں سے بچا جائے تو وہ ہر لحاظ سے مستحسن اور محمود ہیں۔

مالی معاملات کی نزاکت و اہمیت

آخر میں کسبِ معاش، رزقِ حلال کی کمائی تجارت اور صنعت و حرفت اور جملہ مالی معاملات کی نزاکت و اہمیت کے پیشِ نظر تعمیرِ آخرت اور محاسبۂ یوم الحشر ہمہ دم ملحوظ رہنا چاہیئے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر حدیثِ نبوی پیشِ خدمت ہے:۔

عَنْ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَزُوْلُ قَدَمَا ابْنِ اٰدَمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حَتّٰى يُسْئَلَ عَنْ خَمْسٍ عَنْ عُمْرِهٖ فِيْمَا اَفْنَاهُ وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَا اَبْلَاهُ وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَا اَنْفَقَهٗ وَمَا ذَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ۔

(ترمذی)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے روز (جب حساب کتاب کے لیے پیشی ہوگی تو) آدمی کے پاؤں اپنی جگہ سے سرک نہ سکیں گے جب تک کہ اس سے پانچ چیزوں کے بارے میں پوچھ گچھ نہ کر لی جائے گی۔ ایکؔ اس کی پوری زندگی کے بارے میں کہ کن کاموں اور مشغلوں میں اس کو ختم کیا، اور دوسرےؔ خصوصیت سے اس کی جوانی کے بارہ میں کہ کن مشغلوں میں اس کو بوسیدہ اور پرانا کیا، تیسرےؔ اور چوتھے مال و دولت کے بارہ میں کہ کہاں سے اور کن طریقوں اور راستوں سے اس کو حاصل کیا تھا اور کن کاموں اور کن راہوں میں اس کو صرف کیا اور پانچواںؔ سوال یہ ہوگا کہ جو کچھ معلوم تھا اس پر کتنا عمل کیا۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی معارف الحدیث ج ۲ میں اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

——— ''اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قیامت میں ہر آدمی کو اپنے پورے آمد و خرچ کا بھی حساب دینا ہوگا کہ کتنا کمایا، حلال طریقہ سے کمایا یا خدانخواستہ حرام طریقہ سے؟ اور کمائی کو کن

مدّوں میں خرچ کیا، جائز ہیں یا ناجائز ہیں؟ الغرض اس دُنیا اور اس کی زندگی میں ہم جو کچھ کماتے اور خرچ کرتے ہیں آخرت میں اس کا پورا پورا حساب دینا ہوگا۔ وہ بندے بڑے خوش نصیب اور خوش قسمت ہیں جو قیامت کے دن کے اس حساب کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کمانے اور خرچ کرنے میں اور سارے مالی معاملات میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے احکام کی پابندی کرتے ہیں، اور اُن کا انجام بہت خطرناک ہے جو اس طرف سے بے فکر اور بے پرواہ ہیں ——— "

آئندہ صفحات میں مسلمانوں کے مختلف طبقات اور پیشوں میں سے چند علماء کے حالات مثال کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں میں علم کا رواج ہوا تو انہوں نے کس ذوق اور شوق سے علم حاصل کیا اور اس میں اُن کے کام دھندے اور پیشے حارج نہیں ہوئے، پھر مسلمانوں نے ہر طبقہ اور ہر پیشہ کے علماء اور فضلاء کو سر پر بٹھایا، انہیں آنکھوں کا تارا بنایا، ان کے اکرام میں دیدہ و دل نچھاور کیے، اُن کی امامت و سیادت میں علمِ دین کی منزلیں طے کیں۔ جو لوگ بھی بعض طبقوں اور پیشوں کے بارے میں غلط خیالات رکھتے ہیں اور تنگ نظری کا ثبوت دیتے ہیں وہ غور کریں کہ وہ کس طبقہ اور پیشہ کو معیوب قرار دے کر ان علماءِ اسلام پر حرف گیری کریں گے۔ کون سا پیشہ ہے جسے علماء اسلام نے اختیار نہیں کیا اور کون سا طبقہ ہے جس میں فوج در فوج علماء امت اور ائمہ دین پیدا نہیں ہوئے؟

ملاقات نمبر ۱

علامہ عبدالکریم سمعانیؒ سے پہلی ملاقات

دارالعلوم حقانیہ کے کتب خانہ میں

یومیہ معمولات تدریسی مشاغل اور متنوع مصروفیات کے باوجود دارالعلوم حقانیہ کے عظیم الشان اور وسیع کتب خانہ میں متعلقہ کام اور حوالہ جات کی تخریج وغیرہ کے علاوہ بھی علمی سیر و تفریح، نادر و نایاب کتابوں کی زیارت اور تعارف و مطالعہ کتب کے لیے کم از کم یومیہ دس منٹ کی گنجائش نکال لیتا ہوں اور اپنے حد تک یہ کوشش رہتی ہے کہ ہمیشہ کے اس معمول میں ناغہ اور فرق نہ آنے پائے۔

یوں تو ذاتی اور معلوماتی حد تک اس کے بیشمار فائدے بھی حاصل ہوئے۔ تاہم دارالعلوم سے نسبتِ خدمت کے لحاظ سے احقر کو ایک سعادت یہ بھی حاصل ہوئی کہ بیرونِ ملک اور ملک کے اطراف و جوانب سے علمی و مطالعاتی اور کتابی ذوق رکھنے والے کثرت سے آنے والے اضیاف، علماء اور فضلاء اور سکالروں کے وفود جب دارالعلوم حقانیہ تشریف لاتے ہیں تو استاذی و استاذ العلماء محدثِ کبیر شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق مدظلہ، کے حکم سے مجھے دارالعلوم کے وسیع اور عظیم کتب خانہ میں اہم علمی نادر و نایاب کتابوں اور قلمی مخطوطات اور ان کے مصنفین اور دیگر متعلقات سے واردین و صادرین اور ناظرین و سامعین کو محظوظ اور متعارف کرانے میں کوئی حجاب آڑے نہیں آتا۔ اور اب تعارف کی حد تک شاید ہی کتب خانہ کی کوئی کتاب ایسی ہو جو نظروں سے اوجھل ہونے کی وجہ سے رہ گئی ہو۔

کتب خانہ کے نچلے اور بالائی دونوں حصوں میں چاروں طرف مختلف علوم وفنون کی ہزاروں کتابیں ترتیب سے الماریوں میں رکھی ہوئی ہیں۔ کتب خانہ کے وسیع ہال کے مغربی جانب لائبریری کا دفتر ہے، جس میں کتب خانہ کے دو ناظم کتابوں کے اندراج و ترتیب اور کتب خانہ سے متعلقہ امور انجام دیتے ہیں۔ دفتر کے شرقی جانب کھڑکی کھول کر جب کتب خانہ میں داخل ہونا پڑے تو کھڑکی کے شمال مشرقی دیوار کے ساتھ جانب مغرب سے علوم کی ترتیب کے لحاظ سے علم التفسیر کی الماریاں لگی ہوئی ہیں پھر علم الحدیث کی، اسی ترتیب سے جانب مشرق اور دیگر اطراف میں جگہ جگہ کتابوں سے بھری ہوئی الماریوں کے اوپر مختلف علوم وفنون کے چھوٹے چھوٹے تعارفی کتبے لگے ہوئے ہیں۔

مشرقی جانب کے آخری حصے پر "الموسوعات" کے ساتھ والی ایک دوسری الماری پر "علم الانساب" کا کتبہ آویزاں رہتا ہے۔ اس الماری کی کتابیں بھی حسب عادت جب موقع ملا اُلٹتا پلٹتا رہا مگر ایک کتاب جو اس حصہ میں سب سے زیادہ نمایاں، حجم میں فائق، اعلیٰ طباعت اور سرخ رنگ کی رنگین جلد بندی کی وجہ سے سب سے زیادہ جاذب نظر رہی کئی بار ہاتھوں میں لی، سرورق دیکھا مصنف کا نام پڑھا، دیباچہ میں مصنف کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ کتاب کئی بار ہاتھوں میں اُلٹتی پلٹتی رہی مگر چونکہ کتاب قلمی تحریر (قدیم طرز کی شکستہ خط نویسی) کا فوٹو اور عکس ہے، اس لیے تاریخ کے ایک علمی ذخیرے، ایک معتد بہ اور مستند حصے جسے علامہ ابوسعید عبدالکریم بن محمد السمعانیؒ نے کتاب الانساب کے نام سے ایک ہزار چھ صفحات میں محفوظ کرلیا ہے، اس کے مطالعہ واستفادہ اور فیض و برکت سے محروم رہا۔

مگر اس مرتبہ (۲۹، جنوری ۱۹۸۵ء) جب کتب خانہ کی سیر کے دوران حسب عادت کتاب اٹھائی، حسین و رنگین طباعت اور اعلیٰ جلد بندی کی وجہ سے کتاب جاذب نظر تو پہلے سے ہی تھی، اٹھائے بغیر بنتی نہیں، کھولی تو پھر وہی شکستہ خط جسے دیکھ کر دل برداشتہ ہوجاتا مگر اس دفعہ کتاب کھولی کہ اچانک ایک صفحے پر نظر جم گئی۔ صفحہ نمبر ۱۴۰ ہے۔ بڑی سائز کے اس صفحے کے وسط میں جلی حروف کے ساتھ "باب الحاء والذال الحذاء" لکھا ہوا ہے۔ عربی میں "الحذاء" جوتا بنانے والے کو کہتے ہیں۔ "الحذاء" کی اس فہرست میں علامہ سمعانیؒ کے

ارشادات پڑھتا اور دل کے کانوں سے سنتا جا رہا تھا ادھر ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

کے پیشِ نظر قلب پر اللہ کے فضل وکرم اور احسان وامتنان کے نقوش ثبت ہو رہے تھے اس کے ساتھ ساتھ دینِ اسلام کی عظمتیں بھی پتھر کی لکیر بن کر دل پر ثبت ہوتی چلی گئیں کہ اسلام علاقائی، نسلی اور خاندانی تعصبات سے بالاتر ہو کر سب کو نوازتا ہے۔ جو جتنا زیادہ اللہ کی راہ پہ چلتا ہے اتنا زیادہ سنبھالا اور نوازا جاتا ہے۔ اسلام کے دامن نے کتنوں اور کیسوں کو سلامتی کی پناہ سے نوازا، کتنے بےکسوں، بےیار و مددگار اور گرتے ہوئے لوگوں کو ذلتوں سے اٹھا کر عزت کی عظمتوں تک پہنچایا۔

علامہ سمعانیؒ کی بیان کردہ اس فہرست سے معلوم ہوتا جا رہا تھا کہ اسلام نے موچیوں کے طبقہ اور پیشہ سے تعلق رکھنے والے حضرات کو بھی اسلامی علوم وفنون سے پورا پورا حصہ دے کر بہرہ ور فرمایا اور علم وفضل کی عظیم مسندوں پر جلوہ گر فرمایا۔

علامہ سمعانیؒ کی اس تحریر کے پس منظر میں ان کی روح بولتی نظر آ رہی تھی میں نے اس مجلس کو غنیمت سمجھا اور پوری توجہ سے ان کے ارشادات پر ہمہ تن گوش ہو گیا۔

علامہ سمعانیؒ نے الحذاء کے عنوان سے علماء کی ایک جماعت کا ذکر چھیڑ دیا جو نسل اور پیشہ کے لحاظ سے موچی تھے، مگر اپنی فطری استعداد اور فنی صلاحیت سے ان حضرات نے علومِ دینیہ کی قبا میں آفتاب کی کرنیں لگائیں۔ ان محبت ساز علماء کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے شاہراہِ دین پر چلنے چلانے کے لیے اکابرِ امت اور اسلاف کی ایک بڑی جماعت کے پائے عزم کو ثبات، استقامت اور بڑی استواری بخشی۔ اسلام نے دنیا پر یہ واضح کر دیا کہ نسل، قوم، ذات برادری طبقہ اور پیشہ کوئی چیز نہیں ہے، اصل چیز اسلام اور تقویٰ کی راہ ہے، جو بھی اس راہ سے آیا کامیاب رہا جس نے یہ راستہ چھوڑ دیا وہ ناکام ہو گیا۔

علامہ سمعانیؒ نے اسی ملاقات میں متعدد تاریخی شخصیتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ محمد بن سیرینؒ جیسے جلیل القدر تابعی کے علمی کمالات اور علمِ حدیث، ابن عمر بصریؒ کا مرہونِ منت ہے کہ ابن سیرینؒ نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا اور حضرت ابن عمرؒ

نے جابر حذاء (موچی) سے علم حدیث کی تکمیل کی۔ گویا ابن سیرین کے دادا اُستاد ایک عظیم محدث ہونے کے ساتھ ساتھ نسل اور پیشہ کے لحاظ سے موچی تھے۔

ان کے علاوہ علامہ سمعانیؒ نے حذاؤں (موچیوں) کی اس طویل فہرست میں علامہ عبداللہ بن عبداللہ بن عبدالرحمٰن حذاء، محمد بن سالم حذاء، کثیر بن عبید وسطی حذاء، یحییٰ المتوکل حذاء، عاصم بن سلیمان حذاء جیسے محدثین، فقہاء اور ائمہ فن کا تذکرہ بھی کیا جو اپنے زمانے کے مشاہیر ائمہ دین اور علماء میں شمار کیے جاتے تھے۔

جوں جوں ورق اُلٹتے اور صفحات کھلتے گئے، علامہ سمعانیؒ کی اس کتاب میں مختلف پیشوں اور طبقوں سے تعلق رکھنے والے علماء دین اور ائمہ اسلام کے حیرت انگیز حالات سامنے آتے گئے۔ چرواہوں سے تعلق رکھنے والے علماء کے حالات سُنے تو حیرت کی انتہاء نہ رہی کہ ہمارے اسلاف اور اکابر نے اپنے دور میں چراگاہوں اور جنگلوں اور میدانوں کو علوم نبوت کی کھلی ہوئی یونیورسٹی بنا دیا تھا جس میں مزدور، کاشتکار اور چرواہے تعلیم پاتے تھے۔

علامہ سمعانیؒ کے قائم کردہ اس تاریخی روزن سے جب مسلمانوں کا ماضی سامنے آتا گیا تو حیرت و استعجاب کی حد نہ رہی کہ مسلمانوں میں علم کا ذوق اس قدر زیادہ اور قابلِ رشک تھا کہ اونٹوں کے چرواہے میدانوں اور ریگستانوں میں اونٹوں کے چرانے کے ساتھ ساتھ دینی علوم کی تحصیل کر رہے ہیں۔

چند صفحے آگے، پلٹا تو اسی کتاب میں علامہ سمعانیؒ نے علماء کی ایک ایسی جماعت کا تذکرہ بھی کیا جو نسلاً اور عملاً کسان تھے مگر اشاعت و تحصیلِ علم کا ذوق غالب تھا۔ ان کے کھیت اور باغ باغیچے ان کے علمی ذوق کی وجہ سے اسلامی مدارس اور مکاتب بن گئے تھے۔ یہ بجا ہے کہ انہوں نے اپنی مادی غذا اور معاش و دُنیوی ضرورت کے لیے اپنی جائیداد، باغات اور زمینوں کی کاشت و نگہداشت کی مگر اس کے ساتھ ساتھ اپنی اور اُمت کی روحانی غذا اور اخروی فلاح کے لیے علمِ دین کی کاشت و نگہداشت کا ذمہ بھی لے لیا تھا۔ وہ اپنی کھیتی کی آبیاری کے ساتھ ساتھ علمِ دین کی آبیاری بھی کرتے تھے۔ اور جہاں دونوں میں معارضہ اور تقابل پیش آجاتا تو وہاں ذاتی کام!

رکاوٹ نہ بننے پاتا اور ہمیشہ علمی کام کو ترجیح دی جاتی۔ علامہ سمعانیؒ نے جس انداز سے نقشہ کھینچا ہے واقعہ یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔ حقیقت سے سرِمو بھی مبالغہ نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے کھیتوں کی سرسبزی و شادابی کی طرح ان کے علم کا کشتِ زار بھی سدا بہار رہتا تھا۔

کیف ما اتفق ورق پلٹے تو صفحہ ۴۵۴ کی پشت پر جلی حروف کے ساتھ "قصار" لکھا ہوا تھا۔ قصار عربی زبان میں کپڑے کی دھلائی کرنے والے (دھوبیوں) کو کہتے ہیں۔ اسلام کی فیاضی، وسیع النظرفی، وسعت اور علم پروری کا اس سے اندازہ لگائیے کہ دھوبیوں کے طبقہ اور پیشہ سے تعلق رکھنے والوں تک اسلام نے علم دین کی لازوال دولت پہنچائی۔ صرف یہ نہیں اگر آپ علامہ سمعانیؒ کی اس فہرست کو ملاحظہ کریں جس میں انہوں نے دھوبیوں میں علم اور علماء کا تذکرہ فرمایا ہے، تو آپ کو اس زمانہ کے دھوبیوں میں صرف رسمی مسلمانی یا اسلام کی محض رسمی نشانی نظر نہیں آئے گی بلکہ اس جماعت میں بھی بڑے بڑے علماء، فقہاء اور محدثین پیدا ہوئے جنہوں نے ظاہری اور باطنی کثافتوں کو اپنے علم و معرفت کے آبِ مصفا سے دھو کر ختم کیا اور انسانیت کو علم و دیانت کا صاف اور شفاف لباس عطا فرمایا۔ یہ بزرگ کون اور کیا تھے اور کن حضرات سے انہوں نے علم حاصل کیا تھا؟ علامہ سمعانیؒ کی بیان فرمودہ فہرست سے چند ایک کا اجمالاً ذکر کرتے ہیں:۔

علامہ ابوحراص قصّار: بہت بڑے عالم، متقی، پرہیزگار اور بزرگ انسان تھے قصار کے لقب سے مشہور تھے کہ دھوبیوں کا کام کرتے تھے۔

معاویہ بن ہشام قصّار: علم و فضل کے ایک روشن ستارے تھے۔ امام سفیان ثوریؒ اور امام مالکؒ سے علوم نبوت کی تحصیل کی تھی۔

علامہ ابواسحاق ابراہیم بن عبداللہ قصار الاصفہانیؒ: کا لقب قصار (دھوبی) اس لیے پڑ گیا تھا کہ آپ ورع، زہد و تقویٰ، خدمتِ خلق اور اتباعِ سنت کے جذبے سے مُردوں کو غسل دیا کرتے تھے۔ ان کے درس اور تلامذہ کا حلقہ بھی وسیع تھا۔ تمام عمر درسِ حدیث پڑھاتے رہے بلکہ آخر عمر تک اشتغال بالحدیث اور اشاعتِ حدیث کے ساتھ ساتھ مُردوں کے غسل اور کفن کا کام بھی کرتے رہے۔ ۲۶۷ھ میں آنکھوں کی بینائی

جاتی رہی، نظر سے معذور ہوگئے، ۱۳۰ سال کی عمر میں وفات پائی ۔۔۔ آج علامہ کی سمعانیؒ کی تحریر فرمودہ کتاب "کتاب الانساب" کی شکستہ قلمی طرزِ خطی سے اُنس اور مضامین کے تجسس کا قوی داعیہ پیدا ہوگیا۔

جگہ جگہ سے دیکھا ہر طبقہ اور ہر پیشہ سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کا علم دین کو اپنی میراث سمجھ کر اس کی تحصیل واشاعت میں زندگیاں وقف کردینے کی عجیب حیرت انگیز مثالیں سامنے آتی رہیں۔

کتاب الانساب کی شکل میں علامہ سمعانیؒ کی اس ملاقات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے جب بھی کوئی پیشہ اختیار کیا، کوئی روزگار کیا یا کوئی کام کیا، وہ علم دین سے جدا نہیں ہوئے بلکہ معاشی کاروبار کے ساتھ علمی کاروبار جاری رکھ کر یہ ثابت کردیا کہ کسبِ معیشت کے ساتھ علمِ دین سے واقفیت بھی ضروری اور ممکن ہے۔

موچیوں، کسانوں اور چرواہوں، دستکاروں، صنعت کاروں، تاجروں، کاریگروں، پارچہ بافوں، پارچہ فروشوں، درزیوں، دھوبیوں، روغن سازوں، قصابوں، حلوائیوں، آٹا پیسنے والوں، صابون سازوں اور صابون فروشوں، صیقل گروں، شیشہ گروں، لوہاروں، بڑھیوں، لکڑہاروں، شکاریوں اور مزدوروں ۔۔۔ غرض دارالعلوم حقانیہ کے کتب خانہ میں علامہ سمعانیؒ سے اس کتابی ملاقات میں مختلف پیشوں، طبقوں سے تعلق رکھنے والے علماء، فقہاء، محدثین، مفسرین اور ائمہ اسلام کے عجیب اثر انگیز اور انقلاب آفریں حالات سے آگاہی حاصل ہوئی جن کی ذات پر قیامت تک اسلامی علوم اور مسلمان قوم ناز کرتی رہے گی، اور انشاء اللہ آئندہ کی مجلس میں مختلف طبقوں اور پیشوں سے تعلق رکھنے والے علامہ سمعانیؒ کے تحریر فرمودہ علماء دین اور ائمہ اسلام کے مختصر تعارفی حالات بھی نذرِ قارئین کیے جائیں گے۔

ملاقات نمبر ۲

روغن ساز اور روغن فروش علماء کا تذکرہ

تین ماہ سے زائد عرصہ ہونے کو ہے کہ ہزار چاہت اور اشتیاق کے باوجود بھی "کتاب الانساب" کے مصنف علامہ عبد الکریم سمعانیؒ (متوفی ۵۶۲ ھجری) سے شرفِ زیارت و ملاقات اور گفتگو و استفادہ کا دوبارہ موقعہ نہ مل سکا۔

آج (۲۸ اپریل سنہ ۱۹۸۵ء) پھر شوقِ ملاقات اور ذوقِ استفادہ و تحصیلِ علم نے علامہ سمعانیؒ سے کتابی ملاقات کا موقعہ بہم پہنچایا۔

آخر ان کی مجلسِ فیض و برکت (بصورتِ مطالعہ کتاب الانساب) تک دل نے پہنچا دیا، اور اپنی قسمت پر نازاں ہوں کہ ہجومِ مشاغل اور کثرتِ کار کے باوجود بھی اللہ پاک نے اس مبارک اور پُر سعادت مجلس تک رسائی میرے لیے آسان کر دی۔

بہر حال ان کی محفلِ فیض و برکت یا مجلسِ انس و افادہ میں حاضر ہوا، اجنبی ہونے کے باوجود بڑھ کر قریب پہنچا تو دیکھا کہ علامہ سمعانیؒ مفسرین، محدثین، ائمہ فن، علماء اور فضلاء، قضاۃ اور فقہاء کے جھرمٹ میں بیٹھے حاضرین، سامعین اور ناظرین سے ان کا تعارف کرا رہے ہیں۔ "کتاب الانساب" کا صفحہ ۲۳۴ کھلا ہوا ہے۔ گفتگو کا عنوان یا موضوع کی سُرخی "الدھان" ہے۔

عربی زبان میں تیل اور روغن تیار کرنے والے یا تیل اور روغن کی تجارت کرنے والے کو دھان کہتے ہیں۔ علامہ سمعانیؒ نے روغن ساز اور روغن فروش علماء و فضلاء اور مفسرین و محدثین کی جس انداز سے یہاں فہرست مرتب فرمائی ہے یوں لگتا ہے جیسا کہ روغن سازوں اور روغن فروشوں کی اس فہرست میں انہوں نے ملت کے دل و دماغ کا عطر

کھینچ کر سامنے رکھ دیا۔ ان کی قلمی اور علمی تصویریں دیکھیں تو ایک سے ایک قابل اور فاضل نظر آیا، ان کے بشروں سے ذہانت ٹپکتی اور چہروں سے ذکاوت برستی تھی، پوری فہرست پڑھ ڈالی۔

علامہ سمعانیؒ نے علمی برادری کے چُنے ہوئے جن روغن ساز فضلاء، روغن فروش مشاہیر، اہم علمی شخصیتوں اور عظیم سکالروں کی علمی اور تاریخی مجلس اور بڑے معرکہ کی ایک مبارک تقریب کا انعقاد کیا۔ مجھے بھی جب "کتاب الانساب" کے ذریعہ سے انہیں قریب سے دیکھنے، گفتگو سننے، بعض حضرات سے ملنے اور بات چیت کرنے کی سعادت میسر آئی تو ان کی علمی دھاک اور روحانی عظمت کا سکہ دل پر بیٹھ گیا۔

اس مبارک علمی اور تاریخی تقریب میں بظاہر نہ جوشِ خطابت تھا اور نہ الفاظ کی طلسم بندی، نہ منطقی دلائل تھے اور نہ وہ خطابت کا حربہ چلانا جانتے تھے۔ بس اخلاص اور صداقت کی تصویریں تھیں جو اُمت کے سامنے انہوں نے پیش کر دیں۔ علامہ سمعانیؒ کی متین، مدلل اور سلجھی ہوئی گفتگو اس پر مستزاد، آج ان کی محفلِ سعادت میں قلب کو خوب اطمینان اور سکون حاصل رہا۔ اجنبیت کافور ہوئی، پہلی ہی ملاقات میں ایسے گھل مل گئے جیسے برسوں کی پرانی شناسائی ہو۔

علامہ سمعانیؒ کی بیان فرمودہ طویل فہرست سے جن میں پیشہ ور اور مزدور کار علماء و فضلاء سے قارئین کو متعارف کرانے کا گذشتہ نشست میں وعدہ کیا تھا، اس سلسلہ میں آج کی نشست میں چند روغن ساز محدثین اور روغن فروش علماء و فضلاء کے مختصر تعارفی مقالہ کی پہلی قسط پیشِ خدمت ہے۔

مگر یاد رہے کہ ان حضرات کے ہاں روغن سازی اور روغن فروشی کی بڑی بڑی دوکانیں منڈیاں اور تجارتی مرکز تھے، مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کو علمی مشغلہ کا ایسا ولولہ تھا کہ کاروبار کی وسعتیں علمی جمعیتوں کی ہماہمی میں کبھی بھی کسی نقصان کا باعث نہ بن سکیں۔

علامہ صالح بن درہم عظیم محدث اور اپنے فن کے امام تھے۔ ابوالازہر کنیت اور دھان (روغن ساز یا روغن فروش) کے لقب سے مشہور تھے۔ اہلِ بصرہ سے تھے۔ علمِ حدیث محدثینِ عراق سے حاصل کیا تھا۔ ان کے حلقہ درس کی وسعت اور تلامذہ کے سلسلہ کے پھیلاؤ کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت امام شعبہ بن حجاج جیسے عظیم

محدث اور جلیل القدر امام ان سے حدیث کی روایت کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے معاشی بالخصوص تیل کے کاروبار روغن فروشی اور روغن سازی اور کولہو کے چکر کے ساتھ ساتھ درس وتدریس، افادہ واستفادہ، اور تعلیم وتعلم کا دور بھی برابر جاری رہتا تھا۔

ہم جب تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ حسن اتفاق سے صرف ایک دو نہیں تقریباً ہر معتدبہ آبادی والے اسلامی شہر اور قصبات بلکہ دیہاتوں تک میں علماء اور محدثین کا مفت پڑھانے والوں کا ایک بڑا طبقہ موجود رہا جنہوں نے مختلف معاشی کاروبار کے ساتھ ساتھ درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور اشاعت علم کے مشغلہ کو بھی مفت جاری رکھا، تجارت کرتے، زراعت کرتے، محنت مزدوری کرتے، روغن سازی اور روغن فروشی کرتے۔ لیکن یہ سب کچھ کرنے کے ساتھ ساتھ روزانہ بالالتزام پڑھنے پڑھانے کا کام بھی آخر دم تک انجام دیتے رہتے۔

علامہ سمعانیؒ نے اس فہرست میں محمد بن حمزہ بن احمد بن حرب کا تذکرہ بھی کیا ہے جن کی کنیت ابو علی اور لقب دھان (روغن ساز یا روغن فروش) ہے — خطیب بغدادیؒ نے بھی ان کا تفصیلی حال "تاریخ بغداد" میں تحریر کیا ہے۔

ابو علی دھان امام وقت، عظیم محدث اور فیض کثیر کے مالک تھے۔ اپنے معاشی کاروبار روغن سازی اور روغن فروشی کے ساتھ ساتھ تمام عمر علوم نبوت اور تعلیمات رسولؐ کی اشاعت کرتے رہے۔ ان کی معاشی تگ ودو اور ضروریات کی کفالت کے سلسلہ میں سعی، علم دین کی تدریس وتبلیغ کے لیے کسی قسم کی رکاوٹ نہ بن سکی۔ آپ نے مشہور اساتذۂ حدیث ابو بکر علی کوفی اور علی بن عبدالرحمٰن کوفی سے علم حدیث کی تحصیل کی اور جب پڑھاتے تو ان ہی دو حضرات سے حدیث کی روایت کرتے۔

خطیب بغدادی اور ان کے بعض ہم عصر اکابر اساتذہ نے آپ سے علم حدیث کے تلمذ کا شرف حاصل کیا اور خطیب بغدادیؒ نے آپ سے روایت بھی کی ہے۔ موصوف کا بظاہر اپنا معاشی پیشہ دھانیت یعنی روغن سازی اور روغن فروشی تھا مگر اپنے پاس وہ جس قسم کا علمی کمال رکھتے تھے، بغیر کسی لالچ اور معاوضے کے اس علم کو دوسروں تک پہنچانے کو گویا اپنا انسانی

اور اخلاقی بلکہ دینی اور مذہبی فریضہ خیال کرتے تھے۔

علامہ سمعانیؒ نے اس فہرست میں جناب ابو احمد محمد بن عبد اللہ بن احمد بن قاسم بن جامع دھان کا تذکرہ بھی کیا ہے جو بغداد کے رہنے والے تھے۔ روغن سازی اور روغن فروشی کی وجہ سے دھان کے لقب سے زیادہ مشہور تھے۔ حد درجہ متقی، پرہیز گار، صالح، ثقہ اور معتمد محدث تھے۔ علم حدیث سے خصوصی شغف اور اس کی تدریس و اشاعت کے بے حد شیدائی اور حریص تھے۔ آپ کے مشہور اساتذہ حدیث میں ابو رجاء محمد بن حمدویہ، احمد بن علی، حسین بن اسمٰعیل، محمد بن مخلد اور حسین بن یحییٰ کے نام سر فہرست ہیں۔

ابو بکر برقانی، ابو القاسم الازہری، حسن بن محمد بن عمر زرسی، محمد بن علی کو آپ ہی سے استفادہ، تحصیل علم اور شرفِ تلمذ کی بدولت جاہ و منزلت اور علمی شہرت کا عظیم مقام حاصل ہوا۔ اور واقعہ بھی یہ ہے جیسا کہ علامہ سمعانیؒ کی "کتاب الانساب" اور تاریخ کی دوسری کتابوں کے پڑھنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ علماء و محدثین خواہ کسی بھی عہدہ اور پیشہ سے تعلق رکھتے ہوں، کوئی قاضی ہو، مفتی ہو یا روغن ساز اور صابون ساز ہو، تاجر ہو یا مزدور تدریس اور معلمی کا کام نہ کرتا ہو قریب قریب اس زمانہ میں یہ بات ناقابلِ فہم تھی۔

یہ ایک رواج تھا جو قرن ہا قرن سے مسلمانوں میں جاری تھا اور یہ رواج اس وقت تک باقی رہا جب تک کہ عدالتوں اور سرکاری محکموں پر بی اے، ایم اے اور ایل ایل بی اور سول سروس کی ڈگریوں کی بجائے قرآن و حدیث اور علوم نبوت کے سند یافتہ لوگوں کا قبضہ تھا۔ مگر اب تو بدقسمتی سے علمی ذوق، مطالعہ کتب اور تحصیلِ علم کے شوق میں بے حد زوال آگیا ہے غور و فکر تو کجا ذوقِ مطالعہ بھی عنقا ہوتا جا رہا ہے بلکہ اتنی استعداد بھی باقی نہیں رہی کہ دوسروں ہی کے خیالات کو سمجھ کر پڑھ لیا جائے۔ اور آج معاشی کار و بار کے ساتھ علمی اور تدریسی مشغلہ اور مطالعۂ کتب تو کجا کتابوں کی گرد جھاڑنے کی اہلیت اور فرصت بھی بجز چند خوش نصیبوں کے کسے کم ہی نصیب ہوتی ہے۔

ملاقات نمبر ۳

درزیوں کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے ارباب علم وفضل کا تذکرہ

(۳۰ جون ۱۹۸۵ء) آج پھر حسب سابق شوق کے پروں سے اُڑ کر، دل کی عقیدت اور اخلاص ومحبت کا نذرانہ لے کر علامہ سمعانیؒ کی بارگاہ سعادت میں رسائی حاصل کی فیضِ صحبت اور گرانقدر ارشادات کی سماعت کا شرف حاصل ہوا۔ اس مرتبہ بھی حسبِ سابق اس بے بضاعت اور سیاہ کار کو ان سے خصوصی نیاز اور اپنی بساط کی حد تک گہرا نیاز حاصل رہا۔

از راہ محبت وقدر افزائی پہلی ہی ملاقات میں بغیر کسی تکلف اور تصنع کے صداقت اور اخلاص کے ساتھ مجھے گوہرِ مقصود عنایت فرماتے ہوئے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "کتاب الانساب" کا صفحہ نمبر ۱۴۳ کھول کر سامنے رکھ دیا۔ اسے حسنِ اتفاق کہیئے یا علامہ سمعانیؒ کی کرامت، اور یہ درحقیقت فیاضِ ازل کی عنایت کہ اس مرتبہ ورق گردانی کی صبر آزما زحمت سے بھی محفوظ رہا۔

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ علامہ سمعانیؒ سے ایک بار زیارت و ملاقات اور استفادہ کے بعد شاید ہی کوئی نماز ایسی ہو جس کے بعد ان کی مغفرت اور رفع درجات کی دعا نہ کی ہو۔ اور شاید ہی کوئی دعا ایسی ہو جس میں خدا کے حضور علامہ سمعانیؒ سے مزید استفادہ اور حصولِ فیض کی درخواست شامل نہ ہو۔

خدا تعالےٰ کے بے انتہا فضل اور بے پایاں رحمت کے قربان جائیے جس کے صدقے خدا جانے کتنے کشتگانِ یاس، بارانِ رحمت کے چھینٹوں سے زندہ ہوئے

بقول مولانا محمد علی جوہر ؎

اِک شہرِ آرزو یہ بھی ہونا پڑا خجل
ہل من مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

حاضرِ خدمت ہوتے ہی دیکھا کہ علامہ سمعانیؒ طبقۂ خیاط (درزیوں) کے ارباب علم وفضل کی محفل جمائے ہوئے ہیں۔ ان کی مجلس میں اس طبقہ کے مشاہیر علماء رونق افروز ہیں۔ ایک ایسا پاکیزہ منظر پیشِ نظر ہے جو میری معلومات کی حد تک تاریخ علم و فضل میں بس اپنی مثال آپ ہی تھا۔ خدا جزائے خیر دے علامہ سمعانیؒ کو کہ انہوں نے "کتاب الانساب" کے ذریعہ مجھے اس نورانی و روحانی مجلسِ علم و افادہ میں حاضری کا اور ارباب علم و فضل سے فیضیاب ہونے کا موقع بخشا۔ میں نے بھی اسے غنیمت جانا کہ اپنا نامۂ اعمال تو سیاہ ہے ہی، شاید ان بزرگوں کی معنوی ہمنشینی ذریعۂ نجات بن جائے ؎

گرچہ از نیکاں نیم خود را بہ نیکاں بستہ ایم
در ریاضِ آفرینش رشتۂ گلدستہ ایم

ورق کی سُرخی اور گفتگو کا عنوان تھا "خیاط" (درزی علماء و فضلاء) اُجرت اور مزدوری پر کپڑوں کی سلائی کرنے والوں کو عربی میں خیاط (درزی) کہتے ہیں۔ اسلام نے بغیر کسی نسلی، لسانی اور پیشہ وارانہ امتیاز کے درزیوں کے اس طبقہ کو بھی علمِ نبوت کی لازوال دولت سے مالا مال کیا۔ فیاضِ ازل کی اس قدر بے پناہ اور بیمثال سخاوت کے صدقے درزیوں کے طبقہ اور پیشہ میں بڑے بڑے علماء، عظیم فقہاء اور ان گنت مفسرین اور محدثین پیدا ہوئے۔ جنہوں نے اپنی پیشہ ورانہ مہارت، تجربہ و کمال، علمی وجاہت، روحانی جلالتِ قدر اور عالمانہ شکوہ وجلال سے اپنے لیے نہ تو کوٹھیوں کے نرم اور گداز بستروں پر سامانِ استراحت فراہم کیا اور نہ نکھرے ہوئے اور نکہت بیز پھولوں کے معطر ہار پہنے اور نہ لہلہاتے ہوئے سبزہ زاروں میں تفریحی زندگی اختیار کی اور نہ انہوں نے کبھی حکومت کی چشم و ابرو پر نگاہ رکھ کر اپنے اعزاز ورتبہ میں اضافہ کرنے کی کوشش کی، بلکہ انہوں نے خدمتِ دین، اشاعتِ علم درس وتدریس اور تصنیف و تالیف کی راہ اختیار کی اور ساری زندگی کانٹوں کی سیج پر لیٹتے

رہے، راتوں کو اپنی نیند حرام کرتے اور سب سے بے نیاز ہو کر ایک خدا کے حضور نیاز مندی کا اظہار کرتے۔ اور اس دنیا کے دار الامتحان کے آزمائش کے ہر موڑ پہ اپنے ہر بن مو کو چنگاریوں اور شعلوں کی نذر کرتے رہے مگر ناشکری کا کلمہ زبان پر نہ آنے دیا۔ ہر حال میں قانع اور تحصیل و اشاعتِ علم پر شاداں و فرحاں رہے۔

اور حقیقت بھی یہ ہے کہ درزیوں کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے علمی و روحانی مربیوں، اربابِ کمال اور صاحبانِ علم و فضل نے نہ صرف یہ کہ اپنے حلقۂ ارادت، مستفیدین و متعلقین، تلامذہ اور امت کے بیشتر افراد کے ظاہری و باطنی کثافتوں کو اپنے علم و معرفت کے آبِ مصفا سے دھو کر ختم کیا بلکہ انسانیت کو علم و دیانت کا صاف و شفاف لباس عطا فرمایا۔ جسمِ انسان کیلئے علم و فضل کی اعلیٰ قباؤں کی سلائی کی اور ظلم و جہالت کو علم و تقویٰ کی پوشاک پہنائی۔ علامہ سمعانیؒ نے اسی صفحہ پر درزیوں کی نسل اور پیشہ سے تعلق رکھنے والے اربابِ علم و فضل کی ایک فہرست مرتب فرمائی ہے۔

سرِ فہرست علامہ عبداللہ صالح بن راشد خیاط (درزی) کا تذکرہ ہے موصوف بصرہ کے رہنے والے ہیں۔ امام مالکؒ اور امام حسن بصریؒ سے علومِ نبوت کی تحصیل کی اور ان سے روایت بھی کرتے رہے۔ بہت بڑے عالم، صاحبِ علم و فضل، متقی، صاحبِ ورع، پرہیزگار اور بزرگ انسان تھے۔ خدمتِ دین اور اشاعتِ علم ان کا مشغلہ رہا، پوری زندگی اس کے لیے وقف کر دی۔ اپنا پیشہ، کاروبار اور فقر و فاقہ، غربت یا افلاس ان کے لیے خدمتِ دین اور اشاعتِ علم کی راہ میں کوئی مانع اور رکاوٹ نہ بن سکے۔ آپ کے تلامذہ میں حرمی بن عمارہ زیادہ مشہور ہیں جنہیں آپ کے حلقۂ مستفیدین میں علامہ سمعانیؒ نے اولین جگہ دی ہے۔

علامہ ابو سلیمان خیاط (درزی) حجازی اور تابعی ہیں، حضرت ابو ہریرہؓ کے شاگردِ رشید ہیں، نسل اور پیشہ کے لحاظ سے خیاط (درزی) تھے مگر فضل و کمال کے لحاظ سے قرآنی علوم کے حافظ و ماہر تھے اور علمِ حدیث میں بھی بلند مقام رکھتے تھے۔

صالح بن راشد خیاط اور ابو سلیمان خیاط دونوں اپنے اسلاف کی طرح تحصیلِ علم اور پھر خدمتِ دین و اشاعتِ علم کے دوران گرم و سرد حالات، مصائب و آلام، صبر آزما واقعات

اور متنوع امتحانات سے گذرتے رہے، مگر ہر حال میں ان کے دل اطمینان سے اپنے مطلوب یعنی تحصیل واشاعتِ علم میں مشغول رہے اور سخت سے سخت حوصلہ فرسا حوادث و نوازل بھی ان کے دلوں میں علم کی جانب سے کوئی تفرقہ پیدا نہ کرسکے۔ اگرچہ بعض حالات میں معاش کی اور اہل وعیال کی پرورش کی ذمہ داریوں نے انہیں اپنے پیشہ ورانہ کام (کپڑوں کی کترِ بیونت اور سلائی) میں مصروف رکھا مگر قلب ان کا اس حالت میں علم کی جانب مشغول رہا۔

ماسوا سے بے نیازی اور علم کی طرف مکمل توجہ رہی: "دست بکار دل بیار" کا پورا مظہر تھے ان کی ساری زندگی گویا۔

اَلعِشقُ نَارٌ تُحرِقُ مَاسِوَی المَطلُوبِ۔	عشق ایک ایسی آگ ہے جو محبوب کے ماسوا ہر چیز کو جلادیتی ہے۔

کا جلوہ تھی۔

علامہ ابونافع خیاط کا تذکرہ درزیوں کی اس فہرست میں علامہ سمعانیؒ نے تیسرے نمبر پر کیا ہے۔ موصوف تابعین میں سے ہیں علومِ نبوت کی تحصیل وتکمیل امام دارالہجرۃ امام مالکؒ علامہ سالم خیاطؒ حضرت حسن بصریؒ اور محمد بن سیرینؒ سے کی، اور امام مالکؒ سے روایت بھی کرتے رہے۔

زہد وورع، ذوقِ مطالعہ، شوقِ عبادت، اشاعتِ علم اور دینی خدمات کے لحاظ سے اپنے اقران میں ممتاز اور ہمعصر علماء میں تعظیم، قدرومنزلت اور عظمت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

علامہ عمران خیاط بھی نسل اور پیشہ کے لحاظ سے درزی ہیں مگر فضل وکمال اور ازلی عطا ونوال کے لحاظ سے علومِ نبوت کے وارث اور مشاہیر اربابِ علم وفضل سے ہیں۔

علامہ ابراہیم نخعیؒ اور علامہ زید بن وہبؒ جیسی یگانۂ روزگار شخصیات سے قرآن وحدیث کے علوم کی تحصیل کی اس دوران ہر دو حضرات کے حلقۂ تلامذہ میں ممتاز مقام حاصل کیا، اور پھر مدت العمر درس وتدریس، خدمتِ دین اور اشاعتِ علم میں مصروف رہے۔ عبداللہ بن عون جیسے صاحب فضل وکمال کو آپ سے نسبتِ تلمذ پر فخر حاصل رہا۔ آپ کی تدریسی، تعلیمی اور تبلیغی زندگی بھی انقلابی ہے۔ آپ کی تبلیغی مساعی، مواعظِ حسنہ اور تدریسی حلقے حد درجہ پرتاثیر رہے۔

آپ کی پُرتاثیر گفتگو سے بگڑے ہوئے سنور رہے، کئی بدکردار باکردار بنے۔ آپ کی زندگی کی تمام کارگذاری، آپ کی زیرکی و دانائی اور علم پروری و علم دوستی کا بیّن ثبوت ہے۔

ابوالحسن علی بن محمد بن عیسیٰ خیاط (درزی) مشہور عالم، متقی، پرہیزگار اور بزرگ انسان تھے۔ آپ کا تعلق مصر سے ہے۔ ابن العسراد کی کنیت سے زیادہ مشہور تھے۔ علم و فضل، علم دوستی اور علم پروری میں اپنے زمانہ کی آپ ہی مثال تھے۔

محمد بن میمون خیاط (درزی) کو امام سفیان بن عیینہؒ اور امام ابوسعیدؒ جو بنی ہاشم کے موالی سے ہیں، تلمذ کا شرف حاصل ہے۔ دونوں سے علم حدیث کی روایت کرتے ہیں تحصیلِ علم کے بعد زندگی بھر اشاعتِ علم اور درس و تدریس میں مصروف رہے، علمی ذوق غالب رہا، طالبانِ علوم نبوت پروانہ وار آپ کے حلقۂ درس میں آتے، علومِ نبوت کی تحصیل کرتے۔ امام ابوالحسن ساجی اور علامہ ابن صاعد جیسے اکابر علم و فضل کو آپ سے نسبتِ تلمذ پر فخر ہے۔

احمد بن موسیٰ بن ابی عمران خیاط (درزی) بڑے عالم، کامیاب معلم اور وعظ و تدریس میں بیحد مقبول تھے۔ ان کو معدل کا مقام حاصل تھا۔ یعنی اسلامی عدالت میں گواہوں کی عدالت و ثقاہت کا فیصلہ دیتے تھے جس کے بعد گواہ عدالت میں شہادت دے سکتے تھے۔ آپ کے اساتذہ میں سورت بن حکم، محمد بن عباد اور عبداللہ بن عبدالوہاب زیادہ مشہور ہیں۔ آپ کا حلقۂ درس بہت وسیع تھا۔ محمد بن مخلد جیسے اساطینِ علم نے آپ کے حلقۂ درس میں شرکت کی سعادت کو اپنے لیے بہت بڑا شرف جانا اور آپ سے تلمذ و روایت کی نسبت حاصل کی۔

علامہ سمعانیؒ نے درزیوں کی اس طویل فہرست میں بیسیوں علماء، فضلاء، محدثین و مفسرین ارباب علم و فضل اور اساطینِ علم کا تذکرہ کیا ہے جو نسل یا پیشہ کے لحاظ سے درزی تھے مگر فضل و کمال کے لحاظ سے انبیاء کے ورثاء تھے اور علوم نبوت کی دولت سے مالا مال تھے۔

اسی صفحہ پر علامہ سمعانیؒ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:۔

وَجَمَاعَةٌ مِنْ شُيُوخِنَا يَعْمَلُوْنَ عَمَلَ الْخِيَاطِ	ہمارے شیوخ اور اساتذہ کی ایک جماعت سلائی (درزیوں) کا کام کرتی تھی۔

دینِ اسلام کی فیاضی، علوم نبوت کی عمومیت، فیاضِ ازل کی عطا و بخشش اور علم وحی کی وسعت

کا اس سے اندازہ لگائیے کہ خیاطت (سلائی) کا کام کرنے والے درزیوں کو تحصیل واشاعتِ علم اور تعلیماتِ نبوت میں دسترس اور کیا کیا کمالات حاصل تھے۔ علامہ سمعانیؒ کی دی ہوئی طویل فہرست سے یہ اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ گلشنِ علومِ نبوت کی بزمِ علم و فضل میں بعض درزی علماء کو بھی گل سرسبد اور میرِ مجلس کی صدر نشینی حاصل رہی ہے۔ آج ان ہی کی شب بیداریاں اور علمی کاوشیں کروڑہا مسلمانوں کی تمناؤں کا مرغزار، آرزوؤں کا گلزار اور خواہشوں کا سبزہ زار ہیں۔ ان ہی کا مکتب، ان ہی کی تعلیمات، ان ہی کی سیرت و اخلاق اور ان ہی کی تاریخ و تذکرہ، نئی نسل کے جذبات کا خمکدہ، ان کے احساسات کا گل کدہ اور تخیلات کا عشرت کدہ ہے اور موجبِ حیرت و استعجاب ہے۔ یہ امر کہ انہوں نے محنت و مزدوری، مشقت اور معاشی ضروریات کی تکمیل، اپنے پیشۂ خیاطت (سلائی) متنوع مشاغل اور ہمہ جہتی رنگارنگی کے باوجود ہر حال میں گلشنِ علومِ نبوت کو سرسبز و شاداب رکھا۔

ملاقات نمبر ۴

ریشم کا کاروبار کرنے والے اربابِ علم وفضل کا تذکرہ

گرمیوں کا موسم ہے آدھی رات گذر چکی ہے، ذی الحجہ ۱۴۰۵ھ کی دسویں تاریخ ہے۔ آسمان پر ستاروں کی مجلس شبینہ آراستہ ہے، صبح صادق کے طلوع ہونے میں ابھی کافی دیر ہے، کائنات پر سکوت اور ستاروں کی روشنی سے مخلوط تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ علامہ جامیؒ کی مجلسِ پُر سعادت نفحات الانس سے جی بہلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک تخیل کے وسیع گوشوں، اطمینانِ خاطر کی طلبگاریوں، تصورات کے انتشار، کچھ بے چینی اور اضطراب کی تاریکیوں میں ایک درخشاں چہرہ، ایک نورانی اور شیریں تبسم اور پُر اسرار انداز کی نگاہِ دلآویز نے تاریکیاں دور اور اضطرابات کافور کردیئے۔

اور حقیقت بھی یہ ہے کہ آسمان کے سورج کی طرح محبت کا بھی ایک سورج ہوتا ہے یہ جب چمکتا ہے تو روح اور دل کی ساری تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں۔ خلوت و تنہائی، دل کے اضطراب اور رات کی وحشت و تاریکی میں یہ دلنواز اور شیریں آواز، ایسی آواز جو سراسر شفقت اور ہمدردی میں ڈوبی ہوئی آواز تھی، ایسی آواز جس سے ہمت افزائیاں اور سرفرازیاں حاصل ہوئیں جس نے مایوسیوں میں ڈھارس بندھوائی، یہ آواز "الانساب" کے مصنف علامہ ابوسعید عبدالکریم بن محمد السمعانیؒ (المتوفی ۵۶۲ھ) کی آواز تھی جو قصرِ معرفت کے روزن اور گلشن علم کے دریچے "الانساب" سے بول رہے تھے۔

ان کی نگاہیں ایسی دلآویز، گفتگو ایسی شیریں اور اندازِ تخاطب ایسا مشفقانہ تھا کہ دنیا

کی ساری راحتیں اور سکون گویا ان ہی کی نظرِ عنایت میں سما کر رہ گیا تھا اور حقیقت واقعہ بھی یہی ہے کہ جب علم و قلم اور نگاہِ دلنواز کی زبان کھل جاتی ہے تو مُنہ کی زبان کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

آج ان کی محفل اور مجلسِ علم و فضل (بصورت مطالعہ "کتاب الانساب") میں حقیقت اپنی پوری شانِ تاثیر کے ساتھ بے نقاب ہو کر سامنے آ گئی تھی۔ اس سے قبل بھی علامہ عبدالکریم سمعانیؒ سے تین ملاقاتیں ہو چکی ہیں، ان کی روئیداد بھی قارئینِ الحق تک پہنچا دی گئی ہے، اور ہمیں اس حقیقت کے اظہار میں کوئی عار نہیں کہ بغیر کسی غرض اور استفاع کے علامہ سمعانیؒ کا ہم طلبہ کے ساتھ شفقت، عنایت اور حسنِ سلوک دل پر تیرِ محبت کا زخم بن کر رہ گیا ہے جو روح کے لیے ناسور اور دل کے لیے ایک دہکتا ہوا انگارہ ثابت ہو رہا ہے، جس قدر بھی ان کی مجلسِ فیض و افادہ میں حاضری ہوتی رہتی ہے رُوح کا زخم گہرا ہوتا جا رہا ہے اور دل کی تپش بڑھتی جا رہی ہے۔

احقر استفادہ سے قبل بھی علامہ سمعانیؒ کی نیک شہرت، علم پروری، اصاغر نوازی، عظیم علمی و تصنیفی کارناموں اور کسی حد تک مجلسِ افادات سے بے خبر نہ تھا لیکن صورت آشنا نہ تھا کہ مجلس میں حاضری کا موقع ہی نہ ملا تھا۔

اب کے بار بلکہ چوتھی بار جب ان کی مجلسِ رشد و ہدایت (الانساب) میں حاضری کا موقعہ مل رہا ہے، اگرچہ دل جو سوسائٹی کی بے مہری، اپنوں کی سنگدلی، زندگی کے تلخ تجربوں اور درماندگیوں سے پتھر کی طرح سخت ہو گیا مگر "الانساب" کے مصنف و میرِ مجلس علامہ سمعانیؒ کی محبت کی دلنوازیوں سے پگھلنے لگتا ہے گویا روح کو اُن کی نگاہِ محبت نے خرید لیا ہے

صد ملکِ دل، بہ نیم نگاہ مے تواں خرید
خوباں دریں معاملہ، تقصیر مے کنند

علامہ سمعانیؒ اپنی مجلسِ عشق و مستی میں گویا ایک چہچہاتی ہوئی بلبل ہیں جو اپنی شیریں راگوں سے غمزدہ دلوں میں طرب پیدا کر دیتی ہیں۔

اب کے بار جب اُن کی مجلس میں حاضری ہوئی تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ موصوف نے اپنی محفل کو ایسے لوگوں سے سجا رکھا ہے جو کاروبار اور پیشہ کے لحاظ سے نسلاً بعد نسلٍ دستکار، صنعت کار، ریشم ساز اور ریشم فروش چلے آ رہے تھے مگر دُنیا ان کے

علم وخدمتِ دین، زہد وتقویٰ اور علم وفضل کا لوہا مانتی چلی آرہی تھی۔ دستکاری، صنعت گری، ریشم سازی اور ریشم فروشی ان کا ذریعۂ معاش تھا، سینکڑوں افراد اس کاروبار میں مشغول رہتے تھے، مگر ان کے خاندان میں پیشہ اور کاروبار کی طرح تحصیل واشاعتِ علم کا مشغلہ بھی نسلاً بعد نسلٍ چلا آرہا تھا صنعت وحرفت کی وراثت کی طرح علم وفضل کی وراثت پر بھی انہیں فخر وناز ہوا کرتا تھا ؎

تمام عمر تیرے دردِ محبت نے مجھے
کسی سے دل نہ لگانے دیا گلستاں میں

ان کے علوم ومعارف اور دینی وعلمی کمالات کا آئینہ ان کی سیرت وکردار کے نادر نمونے ہیں جو معاشرت اور سوسائٹی میں ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں جن کی ایک جھلک علامہ سمعانیؒ نے "الانساب" کے صفحہ ۲۳۸ پر ثبت فرمائی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں کہ مرو شہر میں ایک علمی خاندان "دیوکش" کے لقب سے معروف اور زیادہ مشہور تھا۔ وجہ یہ ہے کہ ان کے یہاں ریشم سازی اور ریشم فروشی کا کاروبار ہوتا تھا بلکہ ان کا خاندان پورے علاقے میں اس کاروبار کا مرکز تھا۔ خاندان کے افراد ریشم کے کیڑے ایک خاص ترکیب کے ساتھ پالتے اور پھر ان کو دھوپ میں سکھا کر ان سے ریشم نکالا کرتے تھے، چونکہ فارسی میں ان کیڑوں کو دیو کہتے ہیں، اس لیے اسی مناسبت سے اس پورے خاندان کا نام "دیوکش" پڑ گیا۔ علامہ سمعانیؒ نے "الانساب" میں اس باب کا عنوان بھی لفظ "دیوکش" سے قائم کیا ہے۔

دیوکشوں کے اس خاندان کے افراد نے جس طرح ریشم سازی کی صنعت میں ترقی وکمال حاصل کر کے اپنا خاندانی امتیاز باقی رکھا اسی طرح انہوں نے ایمان ویقین، علم وتحقیق، ذاتی تجرباتِ ذوقِ صحیح، کتاب وسنت کا صحیح وعمیق علم اور علم وفکر کی بلندیوں تک رسائی حاصل کی۔ تزکیۂ نفس، روح کی لطافت وذکاوت کی صنعت میں ان کی قوتِ فکریہ کے طائرِ بلند پرواز نے رضائے الٰہی کی بلند شاخوں پر اپنا نشیمن بنایا اور رحمتِ الٰہی کی کھلی فضاؤں میں پرواز کی۔

ابو محمد عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن دیوکش اسی خاندان کے چشم وچراغ ہیں جنہوں نے مختلف علوم وفنون بالخصوص علمِ فقہ میں اپنی خداداد صلاحیتوں اور توفیقِ ایزدی کی رفاقت سے

گرانقدر علمی تنقیحات، نادر تحقیقات اور پیچیدہ فقہی مشکلات کی عقدہ کشائی کی جوان کے علم کی پختگی اور گہرائی کا زندہ وجاوید ثبوت ہے۔ ان کے استقلال واخلاص، توکل، اعتماد، زہد و قربانی، دردِ دل اور سوزِ دروں نے ان کی سیرت و کردار کو جلابخشی اور ان ہی کی مخلصانہ مساعی اور پاکبازی کی وجہ سے خاندانِ دیوکشں کو زندگی اور تاریخی عظمتیں حاصل ہوئیں۔

خدا کی شان کہ جو صنعتیں، کاروبار اور پیشے ہزاروں برس صحیح یقین اور صحیح معرفت سے محروم اور توحید و رسالت کے پیغام سے ناآشنا تھے۔ ابومحمد عبداللہ جیسے پاک باز، نیک سیرت اور خداپرست حضرات کی محنت، ریاضت اور شبانہ روز مشقت سے وہ خاندان، علماء اور اولیاء کے خاندان اور علومِ اسلامیہ اور کمالاتِ دینیہ کے محافظ و امین بن گئے۔

موصوف نے احمد بن شمر بحری کے لڑکوں ابو احمد عبدالرحمٰن اور ابو محمد عبداللہ سے علمِ حدیث کی تحصیل و تکمیل کی۔ ان ہر دو حضرات کا اپنے زمانے میں اکابر اساتذۂ حدیث میں شمار ہوتا تھا۔ دونوں حضرات کو علمِ حدیث میں پختگی، گہرائی اور علاقہ بھر میں مرکزیت حاصل تھی۔

تحصیلِ علم کے بعد موصوف کو اللہ تعالیٰ نے خدمت واشاعتِ علم، درس و تدریس، کے مواقع عطا فرمائے، انہیں بھی اپنے قابل، فائق اور فاضل اساتذہ کی طرح قبولِ عام اور بقائے دوام حاصل ہوا، طالبانِ علومِ نبوت کے مرجع بنے اور شہرت و قبولیتِ عامہ نصیب ہوئی۔ آپ کا حلقۂ درس اور حلقۂ ارادت روز بروز وسیع تر ہوتا چلا گیا۔

آپ کے تلامذۂ حدیث میں ہمارے "الانساب" کے مصنف علامہ سمعانیؒ کے والد کا نام بھی گنوایا جاتا ہے اور انہیں اس نسبت پر ہمیشہ فخر و امتیاز بھی حاصل رہا جیسا کہ علامہ سمعانیؒ کی تحریر سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ ابوطاہر محمد بن محمد بن عبداللہ سنجر اور ابوبکر عتیق بن علی غازی کو بھی علمِ حدیث میں آپ سے تلمذ کا شرف حاصل رہا۔ ۴۹۰ھ کے آغاز میں عازمِ اقلیمِ عدم ہوئے۔

محمد بن عبداللہ دیوکشں، آپ ہی کے صاحبزادے ہیں۔ بڑے ذہین، ذکی اور نقطہ رس تھے، انہیں بھی اپنے عظیم والد کی طرح دستکاری اور ریشم سازی میں تجربہ و مہارت کے ساتھ ساتھ

خدمتِ دین، اشاعتِ علم اور درس و تدریس کے بھی خوب مواقع ملتے رہے۔ خدا تعالیٰ نے اُن کو غضب کی قوتِ استدلال سے نوازا تھا، بیان کی دلآویزی، زبان کی شگفتگی اور دلائل کی قوت سے بحث کے اطراف و جوانب بڑی خوبی کے ساتھ ایک نقطۂ جامعیت پر سمیٹ دیتے تھے جس کی وجہ سے انہیں دینی و علمی حلقوں اور طلبۂ حدیث میں شہرت اور قبولیتِ عامہ نصیب ہوئی۔

ہمارے "الانساب" کے مصنف علامہ سمعانیؒ کو بھی ان سے زیارت و ملاقات اور استفادے کی سعادت حاصل ہوئی تھی جس کا انہوں نے بڑے فخر و امتیاز اور اہتمام کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔

خاندانِ دیوگشؒ جو ریشم سازی کا مرکز اور علاقہ بھر کے لیے مرجع بنا ہوا تھا۔ دیوگشتوں کے اس خاندان میں اللہ تعالیٰ نے ایسے رجال کار اور فردِ رشید کھڑے کر دیئے تھے جنہوں نے دستکاری اور ریشم سازی کے ساتھ ساتھ آدم سازی اور آدم گری کی صنعت میں بھی اپنے خاندان کو ناموری اور نیک نامی کی معراج تک پہنچایا۔ بطورِ مثال ہم نے "الانساب" سے ابو محمد عبداللہ بن محمد دیوگش اور ان کے ہونہار صاحبزادے محمد بن عبداللہ دیوگش کا اجمالی تذکرہ نقل کر دیا ہے۔

سوجھ بوجھ اور قدرے عقل سے کام لینے والوں کے لیے صرف ان دو حضرات ہی کے اس مختصر تذکرہ میں کتنی نصیحتیں، کتنی عبرتیں اور کتنے انقلاب انگیز اسباق موجود ہیں کہ تحصیلِ علم اور پھر اشاعتِ علم کے دوران اگر اپنے ہاتھ کی کمائی سے رزقِ حلال کے قوتِ لایموت پر زندگی اور مستقبل کی جسمانی ساخت کا سانچہ تیار کیا جاتا رہا تو قدرت انہیں مستقبل کی عملی زندگی میں علمی و روحانی سانچے بھی ویسے میسر کر دے گی جس کی طلبگاریوں میں انہوں نے اپنی قیمتی صلاحیتیں کھپا دیں۔

آج نہیں کہ اس دور کا "آج" گذشتہ زمانے کے کل سے بہت زیادہ بدل چکا ہے کہ جب علم دین کی بہشتی ڈگریوں کی نہ حکومت خریدار تھی اور نہ پبلک میں ان معاشی اجازت ناموں کی کوئی طلبگاری تھی، جو بھی اس راہ میں قدم رکھتا سر راہ وسوسہ

ڈالنے والا "خناس" خَسِرَ الدُّنیَا وَالْاٰخِرَۃَ کا بورڈ آویزاں کر دیتا تھا۔

کیا عجب زمانہ تھا اور کیسا عجب تماشہ تھا کہ صرف دیوکشوں کے خاندان کے ان افراد نے نہیں بلکہ ہمارے اسلاف اور مشاہیر ارباب علم وفضل نے

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ (سورۃ آیت)	کیا اپنے بندہ کے لیے اللہ کافی نہیں۔

کے قرآنی سوال کے جواب میں

حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ	ہمارے لیے اللہ بس ہے بڑا اچھا وکیل (پشت پناہ) کتنا اچھا آقا اور کیسا اچھا یارائی فرما۔

کی مضبوط چٹان سے زندگی کے جہاز کو باندھ دیا تھا، مگر تاریخ گواہ ہے "الانساب" کے بارہ سو چھ ۱۲۰۶ صفحات پڑھ جائیے، اس کے علاوہ کتابیں اٹھا اٹھا کر ایک ایک مؤرخ سے دریافت کرتے چلے جائیے سب کے ہاں ایک جواب اور اجماعی جواب ملے گا کہ اوّلاً نہیں:۔

زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِیْدًا۔ (سورۃ آیت)	جھنجھوڑ دیئے گئے اچھی طرح جھنجھوڑنا۔

کے مقام پر رکھا اور پرکھا گیا۔ وہ جب تک اس مقام پر رہے، فقر وفاقہ اور بعض اوقات بھوک کی شدت سے گر گر کر بھی تسلیم ورضا کی راہ چلتے رہے اور ان کے چہروں پر کفرانِ نعمت اور ناشکری کے بل تک کو باریابی حاصل نہ ہو سکی ——— چند ہی دنوں بعد اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر اپنے فضل وکرم کے دھارے کھول دیئے، انعامات اور ربانی تجلیات وَیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ کی صورت میں جلوہ گر ہوتے رہے۔

مگر آج کس کس پہلو پر رونا رویا جائے، کس کس سوراخ کو بند کیا جائے اور کس کس زخم پر پنبہ رکھا جائے۔ علم کے زوال اور امت کے ادبار وتنزل کے لیے کیا یہ کوئی کم واقعہ ہے کہ طلبہ کو رزقِ حلال، پیشہ و دانہ تربیت، دستکاری اور اپنے ہاتھوں سے حلال کی کمائی کے بجائے ابتدائے روز سے انجمن سازی، تنظیم بازی، سیاست گری، صفائی، تہذیب اور خدا جانے کن کن ناموں کا پردہ ڈال کر کیسے کیسے لایعنی مشاغل اور تنعمات کا عادی بنایا جارہا ہے، جن چیزوں کو ہمارے اسلاف نے غیر ضروری سمجھا آج ان ہی چیزوں کو زندگی

کی اوّلین ضرورت قرار دیا جا رہا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ ہمارے اسلاف اور ارباب علم و فضل نے تعلیم کے ایام تعلیم ہی کے لیے گذارے ہیں، تحزب، تحریک، سیاست، انجمن سازی، بننے سنورنے، نوعروسی اور دولہا بننے کی مشق نام کا کوئی کارنامہ ان کی طالب علمانہ زندگی میں نظر نہیں آتا۔

ان کی زندگی صاف ستھری، دھلی دھلائی، اجلی محنت و مشقت اور اپنے ہاتھوں سے رزقِ حلال کی کمائی والی سرد و گرم چشیدہ زندگی تھی، ایسی زندگی اپنے اندر جو پختگی رکھتی ہے سیرت و کردار کی یہ استواری ان لوگوں میں تلاش کرنا بے کار اور فضول ہے جن کی پوری زندگی سرد ماحول میں گذری ہو۔ پیشہ ور، دستکار اور صنعت کار ارباب علم و فضل کا یہ تذکرہ مسلمانوں کی ماضی کا صاف آئینہ اور ایسا آئینہ ہے جس میں مستقبل کو دیکھا بھی جا سکتا ہے اور سنوارا بھی۔

ملاقات نمبر ۵

پارچہ بافوں یعنی کپڑا بننے والے ارباب علم وفضل کا تذکرہ

کئی دنوں سے دل بے چین تھا اور اب بے چینی اضطراب کی حد تک بڑھ رہی تھی۔ علامہ عبدالکریم سمعانیؒ سے ملاقات اور مذاکرات، مبارک مجالس اور ان کے علمی و روحانی اور تاریخی ارشادات پرکیف اور ایمان افروز فیوضات، کب بھولنے کے تھے۔ جب یاد آئے تو شوقِ دید اور جذبِ ملاقات ساتھ لائے۔ مگر یہاں کے مشاغل، کثرتِ کار، تدریسی انہماک، تصنیفی ذمہ داریاں اور تبلیغی فرائض کے پیشِ نظر وقت کو قلت اور تنگ دامنی کی شکایت رہی۔ گذشتہ چار ملاقاتوں میں علامہ سمعانیؒ کو جس حال اور جمال میں دیکھا تھا، قدرت کی بخشی ہوئی فطرت اور انفعالی طبیعت اس کا بہت کچھ اثر قبول کر چکی تھی۔ یارائے سخن نہیں اور نہ وسعتِ صحرا اس کی متحمل ہے، ورنہ دلِ از خود رفتہ کی عاشقانہ سرمستیوں کا ایک دنیا نظارہ کرتی ؎

وسعتِ دِل ہے بہت، وسعتِ صحرا کم ہے
اس لیے مجھ کو تڑپنے کی تمنا کم ہے

سب کچھ ممکن نہ سہی بہت کچھ آشکارا بھی ہو گیا ہے ؎

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالبؔ
جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

ماہنامہ الحق اور بعض دیگر ملکی رسائل کے علاوہ مرکزِ علم "دارالعلوم دیوبند" کے ترجمان ماہنامہ "دارالعلوم" نے بھی کوچہ محبوب میں ہماری رسوائیوں کو دنیا کے اعماق و آفاق

(گھرائیوں اور گیرائیوں) میں پھیلانے کو ایک کارِ خیر اور موجبِ سعادت سمجھا۔[1]
جب ایسی حالت سے ابوعبداللہ محمد بن سعید البوصیری (متوفی ۶۹۶ھ) دوچار ہوئے
تو اُن کی چیخ نکلی اور پکار اُٹھے ؎

عَدَتْكَ حَالِيْ وَلَا سِرِّيْ بِمُسْتَتِرٍ
عَنِ الْوُشَاةِ وَلَا دَائِيْ بِمُنْحَسِمِ

(ترجمہ) "میرے حال سے تم آگاہ ہوچکے ہو اور اب تو میرا رازِ الفت
پوشیدہ نہیں رہ سکے گا (اور پھر خوب رسوائی ہوگی لیکن کروں تو کیا کروں)
میری بیماری تو وہ بیماری ہے جس کا علاج ہی ممکن نہیں" ؎

؎ مریضِ عشق پر رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی

اور اب یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ اِس بازار میں مَیں تنہا نہیں۔ جن احباب نے گذشتہ تین چار صحبتوں کا لطف اٹھایا ہے وہ بھی دل دے بیٹھے ہیں۔ ملک و بیرونِ ملک سے قارئین کے خطوط سے بہت سے رقیبوں کی حالتِ زار بھی معلوم ہو گئی ہے۔ بقول بہادر شاہ ظفر کے ؎

؎ اِک مَیں نے نہیں وصل کا خواہاں ظفر اس کے
ہیں اور بھی پھرتے اسی تدبیر میں دو تین

مگر یہاں تو سینکڑوں پیدا ہو گئے ہیں، اور کیوں نہ ہوں؟ جہاں حسنِ حقیقی ہو، مصنوعی آلائشوں سے پاک ہو، فطرت اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ زلفیں سنوارتی ہو، جمال اور جلوۂ جاناں کا یہ عالم ہو کر ؏

چھپ کے بیٹھے بھی جو چھپ کر کو چھپائے نہ بنے
وہاں کون ایسا بدنصیب ہوگا جو زلفِ محبت کی اسارت سے جی

---

[1] ماہنامہ "دارالعلوم" دیوبند کے ستمبر، اکتوبر، نومبر اور دسمبر ۱۹۸۵ء کے شماروں میں اب تک علامہ سمعانیؒ سے ملاقات کی چار قسطیں شائع ہو چکی ہیں۔

چرائے گا ؂

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
ان کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

جمادی الاولیٰ ۱۴۰٦ھ کی گیارھویں تاریخ ہے، جمعرات کی مبارک ساعت ہے دلِ بے قرار نے طویل فراق کے بعد پھر سے بحمد اللہ کوئے محبوب "الانساب" میں پہنچا دیا ہے[1] فرطِ مسرت اور وفورِ جذبات سے لبریز، دلِ آتش انگیز کے لیے وصال کی یہ گھڑی قرار کا پیغام لائی مگر نگاہِ اشکبار اور چشمِ اشک ریز نے داستانِ جدائی، صدمۂ فراق اور حالِ دل اسی لمحے زبانِ حال بن کر سنا دیا ؂

نَعَمْ سَرٰی طَیفُ مَنْ اَھوٰی فَاَرَّقَنِی
وَالحُبُّ یَعْتَرِضُ اللَّذَّاتِ بِالْاَلَمِ

(ترجمہ) "ہاں سچ ہے کہ مجھے اپنے محبوب کا خیال آگیا ہے اس لیے میری نیند اڑ گئی ہے، چشم اشکبار اور دل بے قرار ہو گیا ہے، درحقیقت محبت عیش و آرام اور لذتوں کو درد و الم سے بدل دیتی ہے"۔

کچھ ایسے ہی حسرت و ارمان سے معمور اور اشتیاقِ دید سے بھرپور جذبات لے کر حسبِ معمول علامہ عبد الکریم سمعانی ؒ کی مجلسِ علم و افادہ میں حاضر ہوا۔ موصوف نے حسبِ سابق پوری توجہ فرمائی۔ ان کی کمالِ شفقت اور وفورِ عنایت سے غم کافور ہوا، جذبات دب گئے، شعور بیدار ہوا، جوش ہوش میں ڈھل گیا۔ اب دل کی آنکھیں بھی کھل چکی تھیں۔ دائیں جانب نظر پڑی تو ایک بڑا کتبہ آویزاں تھا جس کی پہلی سطر پر "باب النون والسین" تحریر تھا۔ اس کے نیچے کی دو سطریں چھوڑ کر چوتھی سطر پر جلی حروف میں موٹے قلم کے ساتھ "النساج" لکھا ہوا تھا۔

جب حجاب ختم ہوا اور مجھے مجلس سے موانست حاصل ہو گئی تو بڑے دلنواز اور

---

[1] کتاب الانساب صفحہ ۵۵۸، ۵۵۹

مشفقانہ لہجے میں لفظِ نساج کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:۔

"ہماری آج کے مجلس کے انعقاد کی غرض اور آج کی گفتگو کا موضوع لفظ نساج کی تحقیق اور نساجی کے پیشہ سے تعلق رکھنے والے اربابِ علم و فضل کا تذکرہ و تبصرہ اور علومِ نبوت کی میراث پانے والے نساجیوں کے علمی و روحانی مراتب اور ان کی دینی و ملی خدمات کا جائزہ لینا ہے"۔

• نَسَّاج عربی کا لفظ ہے، اسے نون کی زبر، سین مہملہ کی تشدید اور آخر پر جیم کے سکون کے ساتھ "نسّاج" پڑھا جاتا ہے۔ نَسْج سے ماخوذ ہے جس کے معنی کپڑا بننے کے آتے ہیں عربی میں کپڑا بننے اور آراستہ کرنے والے کو نسّاج کہتے ہیں۔ علامہ سمعانیؒ نے ارشاد فرمایا۔

اِشْتَهَرَ بِهٰذِهِ النِّسْبَةِ جَمَاعَةٌ يَنْتَسِبُوْنَ اِلَى نَسْجِ الثِّيَابِ (الانساب ص۵۵۸)	علماء کی ایک جماعت اسی لقب (نساج) سے مشہور ہوئی اور وہ کپڑا بننے والوں کی طرف منسوب ہونے لگی۔

وجہ یہ تھی کہ انہوں نے تحصیلِ واشاعتِ علم اور تدریس و تبلیغ کے ساتھ ساتھ رزقِ حلال اور قوتِ لایموت کے لیے کپڑا بننے اور اس کی آرائش کرنے کا کاروبار شروع کر دیا تھا۔

ائمہ وقت، محدثِ زمان، مفسرِ قرآن، شیخِ وقت اور مخدومِ خلائق ہونے کے باوجود انہوں نے عقیدتمندوں کے ہدایا، محبین کے تحائف اور نذرانوں پر اپنے ہاتھوں کی کمائی کو ترجیح دی، دولتمندی، جاہ و منصب کی طلب اور مرجع خلائق بننے کے بجائے فقر و درویشی اور خدمت و عبادت کی راہ اختیار کی اور راجع الی اللہ ہوئے۔ علم و عمل اور بلند روحانی مقامات پر فائز ہونے کے باوجود اُن کی زندگی کے کسی ایک زاویہ، کسی ایک گوشہ اور کسی ایک ادا میں بھی مشیخت اور مخدومیت کی بو نہیں پائی جاتی تھی۔

جہاں علم اور خدمتِ دین کے اعلیٰ اور بلند ترین مقامات اور عظیم درجات حاصل کیے وہاں کپڑا بننے کے کاروبار میں بھی اسوۂ نبوی کے مطابق اپنے ہاتھوں رزقِ حلال کمایا اور تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے بے انتہا خیر و برکت اور وسعت ڈالی مگر اس کے باوجود ان کی تواضع، سادگی، جذبۂ خدمتِ دین و اشاعتِ علم میں کوئی فرق

نہ آنے پایا۔

اپنے تلامذہ تو کجا عام خادموں کو بھی تعظیم سے خطاب کرتے، سینکڑوں خدام، عشاق، تلامذہ اور مریدانِ باصفا موجود رہتے مگر اس کے باوجود وہ اپنے ہاتھ سے سب کام کر لیتے، جھاڑو دیتے، پانی بھرتے، لکڑی کاٹ کر لاتے، گارا بنتے، میٹریل تیار کرتے اور کپڑے کا تانا بنتے کھانا پکانے میں بھی خادموں کے ساتھ اور اگر گھر میں ہوتے تو اہلِ خانہ کے ساتھ برابر کے شریک رہتے اور کوشش کرتے کہ سب کام ان کے اپنے ہاتھوں سے انجام پائیں۔

علامہ سمعانیؒ نے کپڑا بننے والے ائمہ اور علماء کبار کے تذکرہ میں سرِفہرست علامہ ابو حمزہ مجمع بن صمعان النساج کا ذکر کیا ہے۔ جو اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم، عارف باللہ اور عالی ہمت بزرگ تھے۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے انہیں علم و تقویٰ کی دولت سے مالا مال کیا تھا وہاں ان کا دل استغناء، قناعت، صبر و توکل اور اخلاص و للٰہیت کے نور سے بھی معمور تھا۔ تانے بانے کی زندگی میں رہ کر، زندگی بھر علمِ دین کی چادریں بنتے رہے، محنت و مشقت اور ریاضتِ شاقہ سے جسدِ اسلام کے حلّے اور پیراہن تیار کرتے رہے۔ اپنے زمانہ کے نیکوکار، پرہیزگار اور عباد و زہاد لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ اپنے کریمانہ اخلاق، محاسن و اوصاف، بزرگی، علم و حلم، سخاوت اور جذبۂ تبلیغ و اشاعت اور دوسرے فضائل میں بے نظیر تھے۔

آپ کے جلیل القدر اساتذہ میں محدث ابو صالح کا نام سرِفہرست ہے۔ آپ کی علمی قدر و منزلت اور ثقاہت کے لیے یہ بات کافی ہے کہ علامہ سفیان بن عینیہ جیسے عظیم محدث کو آپ سے شرفِ تلمذ پر ناز و افتخار ہے۔ ان کی زندگی کا اصلی جوہر جس نے انہیں اپنے اقران میں ممتاز مقام بخشا اور آج انہیں امت کے لیے نجمِ ہدایت ہونے کی عظمتیں حاصل ہیں وہ یہ تھا کہ تحصیل و تدریسِ علم، خدمت و اطاعت اور ذوقِ عبادت کے ساتھ ساتھ روزمرہ کی زندگی اور عبادات میں بھی اتباعِ سنت، تقویٰ اور ہمیشہ عزیمت پر ان کا عمل تھا۔

ابو محمد نیز تومہ بن عبداللہ نساج اپنے وقت کے علماءِ راسخین اور اولیاءِ کاملین

سے تھے، دنیا طلبی سے دل برداشتہ تھے، خدا طلبی کی راہ اختیار کر چکے تھے۔ دن اُن کے اشاعت و خدمتِ دین کے جذبہ سے معمور اور راتیں اُن کی یادِ خدا سے پُرنور تھیں۔ زندگی بھر مخلوق کے سامنے جبین سائی نہیں کی صرف اللہ کے حضور جبینِ نیاز جھکاتے رہے۔ اپنے رزقِ حلال کی کمائی پر خوش ہوتے۔ اسی غرض سے نساجی یعنی کپڑا بُننے کا کام اختیار کیے ہوئے تھے۔ بصرہ کے رہنے والے ہیں، تابعین سے ہیں۔ انہیں اپنے زمانے کے علماء اور ائمہ میں بھی ممتاز مقام حاصل تھا۔ صحابہؓ میں حضرت انسؓ کی ملاقات سے مشرف ہوئے ہیں۔ بہت بڑے محدث تھے۔ علمِ حدیث ان کا خاص اور محبوب مشغلہ رہا۔ علماء کے نزدیک ثقہ اور معتبر ہیں۔

حضرت جریر ثورؒ بہت بڑے متقی، کامل العلم بزرگ ہیں، ان کا ظاہر و باطن اتباعِ سنت سے آراستہ اور ان کی ساری زندگی اور تمام اوقات سنن و مستحبات سے معمور ہیں۔

کپڑے کا تانا بُننا گذر اوقات کے لیے اختیار کیا تھا، ہمیشہ فقر و فاقہ پر قانع رہے، دُنیا کی بُو بھی اپنے پاس نہیں آنے دیتے تھے۔

ان کے علمی کارنامے، علمِ حدیث کی خدمت و اشاعت اور اسلامی تعلیمات کی ترویج میں ان کی ریاضت و استقامت، تعلیم و تدریس اور دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والوں کے لیے قابلِ رشک ہیں۔

آپ کے اساتذہ میں امام حسن بصریؒ، علامہ ثابت بکریؒ اور علامہ عبداللہ مزنیؒ زیادہ مشہور ہیں جن سے آپ نے علمِ حدیث کی تحصیل اور تکمیل کی ہے۔

آپ کے تلامذہ میں موسیٰ بن اسمٰعیلؒ، بیوذکیؒ، حماد بن زیدؒ، علی بن عثمانؒ واقفی جیسے جلیل القدر محدثین، ائمہ فن کا تذکرہ ملتا ہے، جو آپ کی محدثانہ عظمت اور علمی جلالتِ قدر کی کافی شہادت ہے۔

دراصل علامہ سمعانیؒ نے نساجیوں یعنی کپڑا بُننے والوں کی اس فہرست میں جن اکابر علماء اور اسلافِ امت کے نام گنوائے ہیں سب ایک سے ایک بڑھ کر تھے۔ سب مقبولانِ ازلی تھے جن کو فیاضِ ازل کی طرف سے ایسی استعداد و قابلیت اور صلاحیت

نصیب ہوئی تھی کہ ان کا ہر قال، ہر حال اور زندگی کا ہر لمحہ علم واشاعتِ دین کی عظمت کا آئینہ دار تھا۔ اپنے دوستوں، رفیقوں اور ہر قسم کے ماحول اور سوسائٹی میں جہاں جاتے علمِ دین کی عظمت اجاگر کرتے۔ ان کے وجود علومِ نبوت کے چلتے پھرتے مدرسے تھے، جو بھی ان سے مَس ہوتا یا انہیں دیکھ لیتا۔ اس کی زندگی میں ایک نیا علمی ولولہ اور اسلامی وروحانی انقلاب آجاتا۔

آج کی مجلس میں علامہ سمعانیؒ موج میں تھے اور طبیعت پورے نشاط پر تھی۔ نساجیوں یعنی کپڑا بُننے والے اکابر علماء ائمہ سلف کا تذکرہ کر رہے تھے۔ سامعین وناظرین ہمہ تن گوش تھے۔ اسلاف کی تاریخ سب کے لیے دعوتِ عمل تھی اور ان کا کردار زبانِ حال بن کر سب کو پکار رہا تھا ؎

آغشتہ ایم ہر سر خارے بہ خونِ دل
قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم

تیسرے نمبر پر علامہ سمعانیؒ نے امام ابو القاسم بکر بن یحییٰ نساج کا تذکرہ کیا۔ علامہ ابو القاسم نساج شہر واسط کے رہنے والے تھے، وہیں حدیث کی روایت کرتے رہے۔ آپ کا علمی شہرہ اور محدثانہ جلالتِ قدر اپنے زمانہ میں مسلّم تھی۔ علمی تبحر، صلابتِ فکر، محققانہ اور شگفتہ اندازِ تدریس کی وجہ سے طالبانِ علومِ نبوت کے مرجع قرار پائے۔ ان کی تقریر میں غیر معمولی تاثیر اور علمی گہرائی پائی جاتی تھی۔ ان کا مطالعہ وسیع، نگاہ عمیق اور ذہن کھلا ہوا تھا۔ تحصیلِ علم، تدریس و اشاعتِ دین کے خارزار میں سفر کی صعوبتوں کو خندہ پیشانی اور ہنس مکھ برداشت کرنے کے ساتھ ساتھ نساجی یعنی کپڑا بُننے کا کاروبار کر کے اپنے ہاتھوں سے رزقِ حلال کمانے کے عادی ہو گئے تھے۔ علمِ حدیث کی تدریس ان کا خاص موضوع اور زندگی کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔

ان کے تلامذہ حدیث میں حافظ ابو نعیمؒ، احمد بن عبد اللہؒ اور قاضی ابو العلاءؒ جیسے اکابر اور رجالِ علم کا نام سرِ فہرست ہے جس سے علامہ ابو القاسمؒ کی محدثانہ شان اور علمی قدر و منزلت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

نساجیوں کی اس فہرست میں علامہ سمعانیؒ نے علامہ ابو الحسن خیر بن عبد اللہؒ کا چوتھے نمبر پر تذکرہ فرمایا۔ موصوف عابد، زاہد اور اولیاء کاملین سے تھے۔ مناقبِ عرفانی اور

مدارجِ روحانی پر فائز تھے۔ علم و فضل اور تفقہ و سلوک میں بلند مقام رکھتے تھے۔ نساجی یعنی کپڑا بُننا رزقِ حلال کا ذریعہ تھا۔ تدریس و اشاعتِ علم اور خدمتِ دین زندگی بھر کا شعار رہا۔ فقیری میں شاہی شان رکھتے تھے، اخلاق کے معلم اور روحانیت کے پیکر تھے۔ "الصوفی" کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کا محبوب مشغلہ علمِ دین کی خدمت و اشاعت، ذکر و فکر اور تزکیہ و تصوف تھا۔ سُرّ من رائے کے رہنے والے تھے، بغداد تشریف لائے تو پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے آپ مدتوں اکابر علماء و مشائخ اور اپنے زمانہ کے مشہور ولی اور شیخ کامل شیخ ابوحمزہ محمد بن ابراہیم صوفی کی مجلس و معیت اور صحبت میں رہے اور ان کی خدمت و قربت کو وسیلۂ فیض سمجھا۔ یہ آپ ہی کی طلبِ صادق اور شیخ کامل کے فیضِ صحبت کی برکت تھی کہ آپ پر دُنیا کا ہوش و فرزانگی کے بجائے فکرِ آخرت، تزکیہ و تصوف اور اشاعتِ علم و تبلیغِ دین کی مستی اور دیوانگی غالب رہی۔

آپ کی مجلس و صحبت اکسیر بن گئی تھی۔ وہ دل جو معصیت کی نحوست، گناہوں کی نجاست سوسائٹی کی بے مہری، قانون کی سنگدلی اور زندگی کی محرومیوں سے پتھر کی طرح سخت ہو گئے تھے، آپ کی نگاہِ شفقت کی دلنوازیوں سے پگھلنے لگے۔ آپ کی معمولی سی توجہ اور ایک نگاہِ الفت، متوحش اور باغی روحوں کو خرید لیا کرتی تھی۔

مشہور صوفی اور صاحبِ حال بزرگ ابراہیم خواصؒ اور ابوبکر شبلیؒ نے بھی آپ کی صحبتیں اٹھائیں اور بہت کچھ حاصل کیا۔ علامہ عبدالکریم سمعانیؒ نے ارشاد فرمایا۔

وللصوفیة عنه حکایات غریبة وامور مستطرفة عجیبة۔	حضراتِ صوفیہ کے ہاں آپ کے متعلق خوارق و کرامات کے عجیب و غریب اور نادر واقعات مشہور ہیں۔

موصوف کی علمی فضیلت، روحانی قدر و منزلت، بلند رتبہ اور عظمتِ مقام کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ آپ کے حلقہ سے ابراہیم خواصؒ اور شبلیؒ جیسے نادرۂ روزگار شخصیتیں نکلی ہیں وہی خوش نصیب رہا جسے آپ کی صحبت میں چند ساعتیں حاصل ہو گئیں ۔

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

اس کے بعد علامہ سمعانیؒ نے ابو منصور مقرب بن حسن نساج کا اجمالی تذکرہ سنایا موصوف بغداد کے رہنے والے تھے، اکابر علماء اور ائمہ حدیث سے تحصیلِ علم کی سعادت حاصل کی، آپ کے اساتذۂ حدیث میں ابو یعلیٰ محمد بن حسین فراءؒ، ابوالحسن محمد بن علیؒ اور ابو جعفر محمد بن احمدؒ زیادہ مشہور ہیں۔

نساجی یعنی کپڑا بننے کے کاروبار کی وجہ سے نساج کے لقب سے مشہور ہوئے مقبول اور ثقہ محدث تھے، طالبانِ علوم نبوت کے مرجع قرار پائے۔ خود علامہ سمعانیؒ نے بھی اعتراف کیا ہے کہ وَحَدَّثُونَا عَنْهُ یعنی دیگر علماء کے واسطے سے علامہ ابو منصور کی روایات ان تک پہنچی ہیں۔

نیز اکابر علماء، اربابِ علم و فضل، اساتذۂ حدیث اور مشائخ نے ان کی ثقاہت، خدمت و اشاعتِ علم اور ان کی دینی خدمات و مساعی کی بڑی تعریف اور توصیف کی ہے بڑے پارسا، متقی، پرہیزگار اور خدا رسیدہ انسان تھے۔

آپ کے صاحبزادے احمد بن مقرب نساج بھی اپنے والدِ نامدار کی طرح نادرۂ روزگار علمی اور روحانی شخصیت تھے۔ علامہ سمعانیؒ فرماتے ہیں۔

كَانَ شَيْخًا صَالِحًا فَقِيْهًا۔	بزرگ، صالح، باخدا عالم اور فقیہ تھے۔

نساجیوں یعنی کپڑا بننے کا کاروبار کرنے والے اربابِ علم و فضل کے تذکرہ کی فہرست کے آخر میں علامہ سمعانیؒ نے ابوالخطاب نصیر بن احمد قاری کا ذکر فرمایا جو قرآن کے قاری، علومِ نبوت کے حافظ، اپنے وقت کے جلیل القدر محدث، معاشی اور کاروباری لحاظ سے حائک اور نساج یعنی کپڑا بننے کا کاروبار کرنے والے تھے۔ ان کی علمی عظمت اور محدثانہ جلالتِ قدر کے لیے اتنا کافی ہے کہ خود علامہ سمعانیؒ نے ان سے شرفِ تلمذ کو ناز و افتخار کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

وسمعت منه احاديث۔	مجھے بھی ان سے سماعِ حدیث کا شرف حاصل رہا۔

مجلس اختتام کو پہنچی جو نساجیوں یعنی کپڑا بُننے کا کاروبار کرنے والے اربابِ علم و فضل کے تذکرے و تبصرے پر مشتمل تھی جس میں عبرت و موعظت کے کئی پہلو اور نصیح و خیر خواہی کے کئی عنوان اور مضامین حاصل ہوئے۔ اپنی نالائقی اور نااہلی کے اعتراف کے ساتھ جو کچھ بھی سمجھ میں آتا رہا اور حاصل کر کے محفوظ کیا جا سکا وہی چند ٹوٹے پھوٹے جملوں اور بے ڈھب کی تحریری صورت میں ناظرین کے پیشِ خدمت ہے۔

نساجی کے پیشے سے تعلق رکھنے والے ائمہ سلف، اکابر علماء، محدثین عظام، صوفیا کرام، فقہاء ملت اور رہنمایانِ امت کے اس مختصر تذکرہ کے پس منظر میں ان کی رُوحیں آج پھر تڑپ تڑپ کر پکار رہی ہیں،۔

اُنہیں ــــــ جو علومِ نبوت کی تحصیل میں کوشاں ہیں۔

اُنہیں ــــــ جو علومِ نبوت کی دولت سے سرفراز ہو چکے ہیں۔

اُنہیں ــــــ جو زندگی میں کچھ کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اُنہیں ــــــ جو دنیا کو جہالت کی ظلمتوں سے نجات دلانے اور علم کی روشنی پھیلانے کا جذبہ رکھتے ہیں۔

اُنہیں ــــــ جو اصلاحِ انقلابِ امت کے حوصلے اور عزائم سے سرشار ہیں سے

بے کوشش و بے جہد ثمر کس کو ملا ہے ‏ ‏ ‏ ‏ بے غوطہ زنی گنجِ گوہر کس کو ملا ہے
بے خاک کے چھانے ہوئے زر کس کو ملا ہے ‏ ‏ ‏ ‏ بے جورِ کشی تاجِ ظفر کس کو ملا ہے

جو رتبۂ بالا کے سزاوار ہوئے ہیں
وہ پہلے مصیبت کے طلبگار ہوئے ہیں

ملاقات نمبر ۶

قصابوں کے پیشہ سے تعلّق رکھنے والے اربابِ علم و فضل کا تذکرہ

۱۱ رجمادی الاولیٰ سنہ ۱۴۰۶ھ سے آٹھ ماہ کے طویل عرصہ کے بعد آج ۹ رذی الحجہ سنہ ۱۴۰۶ھ کو پھر سے حضرت العلامہ سمعانیؒ سے کتابی ملاقات کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ اس طویل عرصہ میں شدتِ اشتیاق اور شوقِ ملاقات کے باوجود اپنے عظیم محسن، ایک بے مثال مؤرخ، علم الانساب کے ماہر اور "کتاب الانساب" کے شہرۂ آفاق مصنف علامہ عبدالکریم سمعانیؒ کی بارگاہِ علم و ادب میں حاضری کی سعادت حاصل نہ کر سکا۔ سُن رکھا تھا کہ وصال سے حسرتِ وصال میں جو لذتیں ہیں وہ وصال کے عشرِ عشیر میں بھی نہیں۔ اس قول میں کتنی صداقت ہے کیسے سمجھایا جا سکے اور سمجھائیں تو کیسے ؎

داستان عشق کی ہم کس کو سنائیں آخر
جس کو دیکھو وہی دیوار نظر آتا ہے

بلوغ کی لذتیں کس تعبیر اور کیسے الفاظ کے ساتھ سمجھائی جا سکتی ہیں اور یہ کب ممکن ہے کہ اسے الفاظ کے محدود سانچے میں ڈھالا جا سکے اور نہ آج تک کوئی یہ کر سکا کہ آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دے۔ البتہ جگ بیتی کے ذیل میں آپ بیتی موجود ہوتی ہے۔ حسرتِ وصال آپ بیتی ہے اسے جگ بیتی کیسے بنایا جا سکتا ہے۔

بہرحال مدتوں کی حسرت، سات آٹھ ماہ کا طویل فراق، جدائی کا صدمہ، ذوقِ استفادہ تحصیلِ علم اور جذبۂ ملاقات کے ملے جلے جذبات لے کر علامہ سمعانیؒ کی مجلس روحانی اور

دربارِ علم وعرفان میں باریاب ہوا۔ شناسائی تو پہلے ہی سے تھی۔ اب کے بار مسلسل غیر حاضری اور طویل فراق کو بد ذوقی اور جذبۂ طلب میں عدمِ اخلاص پر محمول کر کے کچھ اعراض سا فرمایا اور ناراضگی کا اظہار کیا۔ مجھے خوشی تھی کہ اپنا سمجھ کر تنبیہ کرنا چاہتے ہیں، ورنہ دل وجان سے چاہنے والے پروانوں اور سچے عشاق کے ہجوم میں کون کسی کی کیا پوچھتا ہے۔ دل سرور سے مسرور تھا اور ضمیر فرطِ مسرت سے گنگنا رہا تھا ؂

ترچھی نظر سے دیکھتے ہیں دیکھتے تو ہیں
ہم شاد ہیں کہ ہیں تو کسی کی نگاہ میں

کسی عذر و بہانہ سازی اور حیلہ جوئی کے بغیر، دل وجان سے ندامت کے جذبات سے معمور، نگاہیں اشکِ ندامت سے بھرپور، معذرت اور طلبِ عفو کی درخواست دربیشِ حضور کر دی ع

اختر صبح مضطرب تابِ دوام کے لیے

دستِ شفقت سر پر رکھا، نگاہِ دلنواز نے دل کی دنیا بدل دی، ارشاد فرمایا اصل چیز ذوقِ تحصیلِ علم اور جذبۂ صدقِ طلب ہے، جب تک یہ موجود ہے کام چلتا رہے گا علوم و معارف کی راہیں کھلتی رہیں گی۔

زبانِ حال سے فرمایا، عزیز! ہمیں تمہاری مشکلات اور مصروفیات معلوم ہی ہیں، تمہارا کام حقائق السنن کی ترتیب و تدوین اور تحقیق و مراجعت اہم کام ہے۔ اس راہ سے بڑے بڑے شیوخِ حدیث، اکابر اہلِ علم اور محدثین کی زیارتیں اور ملاقاتیں بھی ہو جاتی ہیں۔ استفادہ اور علمی ترقی کی راہیں بھی کھل جاتی ہیں۔ تدریس کا مشغلہ بھی علم کے بقاء کا ذریعہ ہے۔ ہدایہ کی تدریس سے علامہ مرغینانی اور فتح القدیر کے مصنف علامہ ابن الہمام کی فقاہت، طرزِ استدلال، استنباطِ مسائل سے استفادہ اور اشتغالِ فقہ کی برکت سے جودتِ ذہن، فقہی مہارت اور علمی ترقی کی منزلیں قریب ہوتی ہیں۔ ایسے اکابر اور رجالِ علم سے تعلق نیک بختی اور سعادتمندی کی علامت ہے، مبارک ہو۔

حضرت سمعانیؒ نے وفورِ شفقت اور کمالِ عنایت و تربیت کے پیشِ نظر میری دلجوئی،

ہمت آفرینی اور حوصلہ افزائی فرمائی۔ زبانِ حال کا خلاصۂ مقال یہ تھا۔ ارشاد فرما رہے تھے، مجھے آپ کے دینی اور علمی مشاغل سے خوشی ہوتی ہے۔ اکابر اور مشاہیرِ اہلِ اسلام بالخصوص علم و دین کے محسنین کے ساتھ تعلق ضرور رکھو۔ ہاں!

لطائف المنن والاخلاق فی وجوب التحدث بنعمت اللہ علی الاطلاق

کے ذریعہ علامہ عبدالوہاب شعرانیؒ کی مجالسِ روحانی سے اکتسابِ فیض بھی نیک فال ہے مگر گاہے گاہے اگر وقت ملے اور فرصت ہو اور طبعاً و قلباً نشاط بھی حاصل ہو تو العالم الفاضل الشیخ تاج الدین اسکندری سے بھی کتابی ملاقات کر لیا کرو۔ ان کی دونوں کتابیں

لطائف المنن فی مناقب شیخ ابی العباس و شیخہ ابی الحسن — مفتاح الفلاح و مصباح الارواح

باطنی کیفیات کی روحانی ترقیات کا ذریعہ ہیں۔ مذکورہ دونوں کتابیں علامہ شعرانی رحمۃ اللہ علیہ کی لطائف المنن کا حسین تحشیہ ہیں۔

"الانساب" کے اوراق پلٹتا رہا، اور حضرت سمعانیؒ کا عرفانی اور روحانی ارشاد بھی سنتا رہا۔ فرما رہے تھے ماشاءاللہ تمہارا مشغلہ بھی دینی اور علمی ہے۔ اسلافِ امت اور اکابرِ ملت نے دنیا و مافیہا کی نعمتوں پر اسے ترجیح دی۔ مگر یاد رکھنا کل اور آج میں بڑا فرق ہے! آج بعض بدنصیب ایسے بھی ہیں جو دین کو بھی معاش کا دھندا سمجھ کر نبھاتے اور روزی کا ذریعہ بناتے ہیں، مگر ہمارے بزرگوں نے کبھی ایسا نہیں کیا، انہوں نے دین کی خدمت کی، علمِ دین کی اشاعت کی اور زندگی گذارنے کے لیے غیروں سے استمداد، سوال اور احتیاج کے بجائے رزقِ حلال کا کوئی ایک پیشہ اختیار کیا اور اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آخرت بنائی ———

دیکھئے! کل قربانی کا دن ہے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی ملت کا احیاء مقصود ہے، تمام دنیا کے مسلمان قربانی کریں گے کہ اللہ کا دین زندہ ہو۔ قربانی عبادت ہے، مگر بدقسمتی سے رواج اور فیشن کے طور پر اپنائی جا رہی ہے۔ مسلمان اور دیندار ہو کر بھی ذبیحہ کے مسنون طریقہ تک سے ناواقفیت عام ہے۔ کرائے کے قصاب بلائے جاتے ہیں جنہیں عبادت و سنت اور ذبیحہ کے حلال و حرام سے کم اور اپنے اجر و مزد سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔

ہمارے اسلاف قربانی بھی کرتے تھے اور ذبح بھی اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے اور

اس پر خوش ہوتے تھے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی سُنت ہے۔

ادھر یہ گفتگو ہو رہی تھی اُدھر الانساب کا دریچہ کھل رہا تھا، نظر اٹھی دیکھا کہ صفحہ نمبر ۴۵۴ سامنے ہے اور صاحب الانساب ارشاد فرما رہے ہیں۔

یہ جو تمہارے سامنے تابعین، فقہاء، محدثین اور ائمہ وعلماء کی طویل فہرست ہے اس میں نظر دوڑاؤ کتنے بڑے بڑے ائمہ، محدث ومفسر، مجتہد وفقیہ، علماء اور ملت کے رہنما نظر آ رہے ہیں۔ یہ سب علم دین کے ماہر، قرآن وحدیث کے عالم فاضل اور امت کے عظیم محسن ورہنما تھے۔ انہوں نے کبھی غیر کے سامنے دستِ سوال نہیں پھیلایا، احتیاج کا اظہار تک نہیں کیا۔ دین اور علم دین کی تحصیل، تدریس اور خدمت واشاعت کی اور اجر کی اُمید صرف خدا سے رکھی، زندگی گذارنے کے لیے رزقِ حلال کمایا۔

کوئی بین الاقوامی تجارت، وسیع کاروبار یا کارخانوں اور بڑے پیمانے کی صنعت وحرفت سے نہیں بلکہ حلال جانور ذبح کر کے گوشت فروشی کرتے اور خدمتِ دین میں اطمینان حاصل کرنے کے لیے اپنے ہاتھوں کی مشقت اور مزدوری سے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتے۔

احقر نے "الانساب" کے سامنے والے صفحہ پر صاحب الانساب کی ہدایت کے مطابق دیکھنا شروع کیا، جلی قلم کے ساتھ باب القاف والصاد کے متصل بائیں جانب سرخی کے ساتھ القصاب لکھا ہوا تھا۔ علامہ سمعانیؒ فرمانے لگے لفظ قصّابؒ بفتح القاف وتشدید الصاد وفی آخرھا الباء الموحدہ" عربی میں اُس شخص کو کہتے ہیں، جو اپنے ہاتھوں سے بکری اور دیگر حلال جانوروں کو ذبح کرتا ہے اور پھر ان کا گوشت بازار میں فروخت کرتا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اردو، فارسی اور بعض علاقائی زبانوں میں بھی حلال جانوروں کو ذبح کر کے ان کا گوشت بیچنے والوں کو قصاب کہتے ہیں۔ یہ عربی زبان سے ماخوذ اور مانوس لفظ ہے۔ مگر اس حیثیت سے نا مانوس ہے کہ بڑے بڑے علماء، محقق، مصنف، مبلغ اور محدث بھی قصاب گذرے ہیں۔

علامہ عبدالکریم سمعانیؒ کو خدا نے زبان کی شیرینی، دردِ دل اور سوزِ دروں سے نوازا ہے۔ اسلاف کی تاریخ اور امت کے رجال کار اور ان کے کارنامے اور ان کے انساب انہیں

از بر ہیں معلومات اور علم و عرفان کے بحرِ بیکراں ہیں، بند ٹوٹ گیا، تاریخ کے صفحات پلٹنے لگے عرف ذبیحہ کرنے اور گوشت بیچنے والے قصابوں کا ذکر تھا۔ یہ امتِ محمدیہ کا قیمتی سرمایہ اور ملتِ اسلامیہ کا اصلی جوہر تھا جنہوں نے افرادِ ملت کی علمی اور روحانی زندگی اور ترقی و کمال کے لیے ایسی بہترین، تازہ اور طاقتور غذا مہیا کی کہ پوری امت کے لیے گویا ریڑھ کی ہڈی ثابت ہوئے۔ قصابوں کے پیشہ سے تعلق رکھنے والے اربابِ علم و فضل، علماء اسلام اور راہنمایانِ ملت اور مشاہیر اہلِ علم کی تعداد بے شمار ہے۔ ان کی ذات سے توحید کو فروغ، علوم و معارف کو ترقی، اخلاق کو بالادستی اور اسلام کے پیغام کو ہمہ گیری حاصل ہوئی ہے۔

قصابوں کی اس فہرست کے آغاز میں امام حسن بن عبداللہ کا تذکرہ ہے۔ موصوف اپنے وقت کی عظیم شخصیت، عالم و فاضل اور علمِ دین کے بے لوث خادم تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے مولیٰ حضرت نافعؒ سے علمِ حدیث کی تحصیل کی۔ موزوں پر مسح کی مشہور روایت حضرت نافعؒ کے واسطہ سے بیان فرمایا کرتے تھے۔

عن الحسن بن عبد الله القصاب عن نافعؒ عن عبد الله بن عمرؓ قال وقت لنا رسول الله صلى الله عليه وسلم فى المسح على الخفين يوماً وليلة وللمسافر ثلثة ايام ولياليها۔

حسن بن عبداللہ قصاب سے روایت ہے فرماتے ہیں۔ حضرت نافعؒ نے عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موزوں پر مسح کے لیے وقت کی تعین فرمائی مقیم کے لیے ایک دن اور ایک رات اور مسافر کے لیے تین دن اور تین رات تک موزوں پر مسح کرنے کی اجازت ہے۔

امام حسن قصاب طلبِ علم اور پھر اشاعتِ علم دونوں مرحلوں میں کردار و اعمال اور سیرت و اخلاق اور ظاہر و باطن سے خوب واقف تھے۔ تمام زندگی تحصیل و اشاعتِ علم سے وابستہ رہے، مگر رزقِ حلال اور معاشی ضروریات کے لیے درِ غیر پہ جبیں سائی کی خست و ذلت سے اپنی جبین کو آلودہ نہیں کیا۔ سب سے بے نیاز اور خدا سے نیازمند رہے۔ قوتِ لایموت اور زندگی کی معاشی ضرورت کی کفالت کے لیے قصابی کا پیشہ اختیار کیا۔ علم کی فضیلت، اہلِ علم کی

صف میں اوّلیت، اپنے ہم زمانہ اربابِ علم و فضل کے ساتھ معاصرت، معاشرہ میں بلند قدر و منزلت اور علوِ شان، اس پیشہ کے اختیار کرتے ہیں نہ ان کے لیے شرم و عار بن کر سامنے آئے اور نہ رزقِ حلال کے کمانے سے کسی مانع کو رکاوٹ بن کر سامنے آنے کا موقعہ دیا۔

موصوف تابعی تھے، صحابہؓ کی زیارت سے مشرف تھے۔ ان نگاہوں کو دیکھا جو براہِ راست چہرۂ نبوت کے انوار و تجلیات سے منور تھے اور ایسی نگاہوں کے منظورِ نظر تھے جو تاجدارِ نبوت کے رُخِ انور کی ضیا پاشیوں سے معمور اور عشقِ نبوت کی کیف و مستی سے مخمور تھے۔ ان کا اسوہ صحابہؓ کا نمونہ اور ان کی سیرت و کردار کی ایک جھلک تھی۔ ان کا فقر و درویشی، ان کی خدمت و اشاعتِ علم، ان کا کسبِ حلال اور ان کی محنت و مشقت پر حضراتِ صحابہ کرامؓ کی مُہر لگی ہوئی تھی۔ امام حسن قصابؒ کی زندگی اور پاکیزہ کردار پوری امت کے علماء اور خدام اسلام کے لیے ایک سبق، ایک عبرت انگیز نصیحت، شوقِ علم اور ذوقِ عمل کی انگیخت کا ذریعہ ہے۔

قصابوں کے پیشہ سے تعلق رکھنے والے مشاہیر علماء اسلام کی اس فہرست میں علامہ سمعانیؒ نے ابو عبداللہ حبیب بن ابی عمرہ القصاب کا تذکرہ فرمایا۔ حبیب قصاب بہت بڑے محدث، مرجع علم اور منبعِ جود و سخا تھے۔ طالبانِ علوم نبوت کے حلقہ میں مشہور، تدریسی معیار کے لحاظ سے محبوب، گویا طلبہ کے دل کی دھڑکن تھے۔ علمی مقام اور روحانی قدر و منزلت میں علوِ شان کے مالک تھے۔ ذاتی وجاہت اور شخصی کردار نے انہیں تمام حلقوں اور عام معاشرہ میں ایک بلند مقام دے دیا تھا۔ مرکزِ علم کوفہ جو محدثین کا شہر، فقہ کا گہوارہ، علوم و معارف کا گڑھ اور تفسیر و حدیث کا مخزن تھا جس کی ہوائیں اور فضائیں بھی علم و معرفت کے انوار سے بھرپور، قساوتِ قلبی اور جہالت کی تاریکیوں میں ذریعہ نور تھیں۔ موصوف کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا، یہی ان کا مسکن تھا اور اسی نسبت پر انہیں فخر اور ناز تھا، ان کے اساتذہ کثیر اور بے شمار تھے، مگر حضرت سعید بن جبیر ان سب کے گلِ سر سبد تھے۔ موصوف کو ان سے تلمذ اور روایتِ حدیث کا شرف حاصل ہے۔ حبیب قصاب کے تلامذہ کا حلقہ پھیلا ہوا اور بہت وسیع ہے۔ گو علامہ سمعانیؒ نے ان کے تلامذہ کی فہرست نہیں دی اور نہ اس سلسلہ میں

کوئی تفصیلی عندیہ بیان فرمایا ہے۔ تاہم ان کے اس ایک ارشاد سے حبیب قصاب کی عظمتِ تدریس اور مرتبۂ علم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ علامہ سمعانیؒ ارشاد فرماتے ہیں:۔

وروی عنہ الثوری — یعنی ان سے امام سفیان ثوریؒ نے حدیث کی روایت کی ہے۔

علمِ حدیث کے جلیل القدر امام حضرت سفیان ثوریؒ آپ کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہیں آپ کے سامنے استفادہ اور تحصیلِ علم کی خاطر زانوئے تلمذ تہہ کر چکے ہیں اور آپ سے روایتِ حدیث بھی کرتے ہیں اور آپ سے تلمذ پر ناز اور فخر و اعزاز کا اظہار بھی کرتے ہیں حبیب قصاب کے عظمتِ مقام اور رفعتِ شان کے لیے اتنا کافی ہے کہ حضرت امام سفیان ثوریؒ جیسے محدث نے ان سے کسبِ فیض کیا اور آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے۔

اسلاف کا تذکرہ، اکابر کا تقوٰی، ائمہ اسلام کی سیرت اور محسنینِ امت کے سوانح و آثار گویا فیضانِ رحمت کا آبشار تھا۔ علامہ عبدالکریم سمعانیؒ کی طبیعت کے بند ٹوٹ چکے تھے۔ جلال و جمال اور علمی و روحانی کمال اپنے پورے بخت و اقبال کے ساتھ تموج میں تھا، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ علامہ سمعانیؒ آج ہی اپنا جذبۂ اسلامی اور حمیتِ ایمانی پورے زور اور خلوص کے ساتھ افرادِ امت میں منتقل کر دینا چاہتے ہیں۔ ابھی ایک کا تذکرہ اور اس کے اوصاف و کمالات کا بیان جاری تھا کہ دوسرے کا نام آتے ہی اس کے وصف و کمالات کے بیان میں کھو گئے۔ ابھی وہ تشنۂ تکمیل ہے کہ تیسرے کے حسن و جمال اور علمی و روحانی کمال نے اپنے تذکرہ و بیان کی دعوت دے دی، ارشاد فرمانے لگے:۔

عبدالعزیز بن موسٰی قصاب بھی کسی بڑے کاروباری خاندان یا سرمایہ دار اور کارخانے دار باپ کے بیٹے نہیں تھے اور نہ ان کی یہ بے مثال عزت اور بے نظیر عظمت، وفورِ سرمایہ و دولت کی مرہونِ منت ہے اور نہ ہی انہیں کوئی دنیاوی جاہ و منصب عہدہ تھا یا وزارت کی براجمانی حاصل تھی جس نے لوگوں کو ان کا تابع بنا دیا تھا۔ فقر و درویشی اور علومِ نبوت کی مصاحبت نے انہیں شہرت دی، پاکیزہ کردار نے انہیں عظمت بخشی اور اخلاص و للّٰہیت نے انہیں رفعت عطا کی، اللہ کی حقیقی عبدیت نے انہیں عظمتِ آبرو کا سرتاج بنا دیا۔ ان سب کا

مرجع اور نقطۂ مرکز، دین اور علمِ دین سے پرخلوص، دائمی اور بے غرض وابستگی ہے۔ علم زندہ ہے جو اس سے وابستہ ہو گیا ہمیشہ کی زندگی پا گیا ہے

بنا ہے شاہ کا مصاحب پھرا ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

موسٰی قصاب کے بیٹے عبدالعزیز قصاب بھی کوئی شہنشاہ نہیں تھے، قصاب تھے، بکریاں اور حلال جانور ذبح کر کے گوشت بیچتے، اس سے جو کمائی ہوتی اس سے خود بھی گزر اوقات کرتے اور اپنے بچوں اور افرادِ خاندان کا پیٹ پالتے، مگر ان کا نام اور کام زندہ ہے۔ اور بادشاہوں کے تذکروں سے ہزار چند بڑھ کر تابندہ ہے۔ موصوف مرو کے رہنے والے تھے مرو کے باشندے انہیں اپنا شیخ تسلیم کرتے ہیں اور جب بھی ان کا نام آتا ہے تو ان کی عظمت و رفعتِ شان سے اہلِ مرو کے سر جھک جاتے ہیں۔

عبدالعزیز قصاب کو بھی خدا تعالیٰ نے طبیعت معتدل اور فطرت سلیم بخشی تھی، دنیا کا حسن و جمال اور اس کی ظاہری چمک و رعنائی ان کی نگاہوں کو خیرہ نہ کر سکی۔ آپ نے دنیا داروں اور سرمایہ داروں کی راہ چلنے کے بجائے علم اور خدمتِ دین، فقر و درویشی اور غربت و مسکنت کی زندگی کو ترجیح دی۔ انہوں نے بادشاہوں کے درباروں، سرمایہ داروں کی چوکھٹوں اور دنیا داروں کے دروازوں پر انسانیت کی آبرو کو رسوا نہیں کیا بلکہ خالق کون و مکاں کی بارگاہِ صمدیت میں سجدہ کیا اور ایسا سجدہ کہ سب سے بے نیاز ہو گئے ۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

ان کی نظر اللہ کے جمال اور اس کی قدرت و کمال پر تھی تو ذات پات، نسب و نسبت، مزدوری اور پیشہ و دستکاری ان کے لیے رکاوٹ نہ بن سکی۔ تحصیلِ علم اور ذوقِ طلب کی تکمیل کے لیے ابوالحسین عبدالرحمٰن بن محمد دھان (روغن ساز و روغن فروش) کی درس گاہ میں پہنچ کر ہمہ پہلو فنافی العلم ہو گئے اُس وقت آنکھ اٹھائی جب ان کا دامن علوم و معارف کے خزینہ سے لبریز ہو چکا تھا، علومِ نبوت اور عرفان و معرفت کے لازوال خزانوں سے مالا مال ہو چکے تھے

جو سب سے کٹ کر علم سے جڑ جائے تو علم اس کے سینہ کا دفینہ بن جاتا ہے۔ العلم لا یعطیك بعضه حتی تعطیه کلك۔ علم تجھے اپنا بعض حصہ بھی نہیں دے گا جب تک تُو اپنے تمام جذبات واحساسات، تعلقات ومعاملاتِ دنیوی اور قلبی علائق سے کٹ کر صرف اور صرف علم ہی کا طالب، اسی کا عاشق زار اور اپنی ہر ادا سے اسی کا چاہنے والا نہ بن جائے

عبدالعزیز قصاب نے اسی راہ کو اپنایا، اسی کو اپنی زندگی کا اصول بنایا، اسی کو اپنے نفع و ضرر اور اللہ کے قرب کا ذریعۂ وصول بنایا، علم کی راہ سے منزل تک پہنچنا چاہا، پہنچے اور ایسے پہنچے کہ خدا نے فقیری میں امیری، بےکسی میں بادشاہی اور بےبسی میں من چاہی کی رفعتوں پر پہنچا دیا۔ ان کے شرف ومنزلت اور مرتبہ ومقام کے لیے یہ کیا کوئی کم دلیل ہے کہ علامہ سمعانیؒ نے اعاظم رجال کی اس فہرست میں تیسرے نمبر پر تذکرہ فرمایا ہے اور ان سے اپنے دادا کی روایت کو فخر وناز اور عزت و امتیاز کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

ارشاد فرمایا کہ عبدالعزیز قصاب کا ہمارے خاندان کے اکابر اور خاندانی بزرگوں پر بھی بڑا احسان ہے کہ ان ہی کے ذریعہ سے ہمارے خاندان میں علمِ نبوت کی دولت منتقل ہوئی ہے، فرمایا:۔

سمع منه جدی الامام ابوالمظفر السمعانیؒ۔	میرے جدِ بزرگوار امام ابوالمظفر السمعانیؒ نے ان سے حدیث کا سماع کیا۔

اس کے بعد علامہ سمعانیؒ نے ابو رافع قصّاب، ابوعبداللہ محمد بن علی قصاب کا تذکرہ کیا۔ ابھی اس سے فارغ نہ ہونے پائے تھے کہ ابوخباب عباد بن عون قصّاب کے سوانح و آثار، ان کے حالات کا تذکرہ، کمالات پر تبصرہ اور ان کی علمی و دینی اور اشاعتی خدمات، بڑی عقیدت واعتراف اور بڑی محبت اور بڑے جوش وجذبے سے بیان کرنے لگے۔

ارشاد فرمایا حضرت عباد قصاب مصر کے رہنے والے تھے۔ اس لیے مصر سے نسبت پر معروف تھے۔ گوشت فروشی ان کا پیشہ تھا۔ انہیں تابعین میں جلیل القدر اساتذۂ حدیث اور ماہرینِ فن سے علوم نبوّت کی تحصیل وتکمیل کا شرف حاصل ہوا۔ ان کے اساتذہ میں سرِ فہرست

حضرت قتادہ اور حضرت زرارہ بن ابی اوفی ہیں۔ حضرت عباد قصاب دونوں حضرات سے حدیث کی روایت کرتے ہیں اور دونوں سے نسبتِ تلمذ پر انہیں فخر تھا۔ موصوف کا علم، مسائل اور فتاویٰ اس لیے مشہور، مقبول اور معتمد تھے کہ ان پر براہِ راست حضرت قتادہ اور حضرت زرارہ کی مہر لگی ہوئی تھی۔ آپ کے علم و فضل اور شرف و تفوق کی ایک دنیا قائل تھی۔ آپ کے ہاں طالبانِ علومِ نبوّت کا ہجوم رہتا تھا۔ دسیوں کے دامن مرادوں سے بھرے جا رہے ہیں، دسیوں کو دستارِ فضیلت اور سندِ علم سے نوازا جا رہا ہے، دسیوں کو نئے داخلے مل رہے ہیں۔ عجیب سماں تھا اور عجیب منظر تھا، اسلام کی عظمتِ نشان جھلکتی نظر آتی تھی۔ بصرہ کے تمام مشائخ، محدثین اور بڑے بڑے علماء نے آپ سے کسبِ فیض اور علمِ حدیث کا اکتساب کیا۔ اس لیے تو آپ اہلِ بصرہ کے شیخ مانے جاتے تھے۔

ابھی عباد قصاب کا ذکر جاری تھا، علامہ سمعانیؒ کی شیریں بیانی کا کیا کہنا، تذکرے و تبصرے، تعارف اور سوانح و کارنامے سنا سنا کر سامعین و ناظرین کا یقین بنا رہے تھے۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ یہی یقین پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ یہ دنیا اور اس کی رونقیں چند روزہ اور فانی ہیں۔ دنیا کی وسعتیں اور تنگیاں سب آنی جانی ہیں، اصل چیز علم دین اور فکرِ آخرت ہے جنہیں یہ دولت ملی وہی باقی اور جاودانی ہیں۔

اسی ذیل میں دورانِ گفتگو ابو حمزہ میمون قصّاب کا ذکرِ خیر چل پڑا، ارشاد فرمایا موصوف بڑے متقی، پرہیز گار اور سیرت و کردار کے مالک تھے۔ انہیں ابتدائے شعور ہی سے تحصیل علمِ حدیث کا شوق حضرت ابراہیم نخعیؒ اور امام حسن بصریؒ کی درسگاہ میں لے گیا۔ میمون قصاب نے دونوں اساتذۂ حدیث سے مکمل استفادہ کیا۔ اساتذہ نے بھی طلب صادق اور جوہر باصفا دیکھ کر پوری توجہ کی اور شفقت فرمائی۔ علومِ نبوت کا خزانہ وافر اپنے اس ہونہار شاگرد کے دل و دماغ اور قلب میں گویا انڈیل دیا۔ قصابوں کے گروہ سے تعلق رکھنے والے اللہ کے اس نیک بندے اور اسلام کے عظیم خادم اور علومِ نبوّت کے بے مثال عالم و فاضل کے علم و فضل اور علمِ حدیث و تفسیر میں عبورِ کامل کے چرچے پوری دنیا میں پھیل گئے۔ طلبہ دور دراز علاقوں سے رختِ سفر باندھ کر حاضرِ خدمت ہوتے اور جھولیاں مرادوں سے بھر بھر کر واپس ہوتے

علوم و معارفِ نبوت کی تقسیم جاری تھی، میمون نقصاب ساقی کے مرتبۂ بلند پر فائز تھے۔

عظیم اور جلیل القدر محدثین، امام الحدیث حضرت امام سفیان ثوریؒ، علمِ حدیث کے مشہور امام حماد بن سلمہؒ اور عبدالحمید بن منصورؒ جیسے افاضل و ائمہ حدیث بھی آپ ہی کی بارگاہِ علم و فضل میں خادمانہ حاضر ہو کر علمِ حدیث کی دولت سے مالامال ہوئے۔

اس قدر جلیل القدر اکابرین اور ائمہ حدیث کے استاد و شیخ الحدیث، پیشہ اور کاروبار کے لحاظ سے قصاب تھے مگر سبحان اللہ! کہ علم و فضل اور دینی خدمات و درجات کے لحاظ سے ایک دنیا کے امام و مقتداء تھے۔ ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء

اس کے بعد قصابوں کے پیشہ سے تعلق رکھنے والے کئی ایک مشاہیرِ اسلام اور اربابِ علم و فضل کا تذکرہ فرماتے رہے، احقر محفوظ کرتا رہا، حافظہ تو گناہوں نے کمزور کر دیا ہے۔ البتہ قلم پر زور رہا۔ یہ بھی محض خدا تعالےٰ ہی کا فضل و کرم ہے کہ کچھ تو محفوظ ہو جاتا ہے اور اکابر کی سنت بھی یہی ہے۔

کل ۹ ر ذی الحجہ سے حضرت علامہ سمعانیؒ کی بارگاہِ روحانی میں مسلسل حاضری رہی۔ آج ذی الحجہ کی دسویں تاریخ اور عید الاضحیٰ کا مبارک دن ہے، قربانیاں ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ علامہ سمعانیؒ کی ناراضگی ختم ہو چکی تھی، ان کا اعراض کامل توجہ میں بدل چکا تھا۔ زبانِ حال سے ارشاد فرمایا مبارک ہو، اکابر اور اسلاف کا شب و روز علم سے تعلق تھا، خوشی اور غمی علم سے وابستہ تھی، تنگی اور وسعت پر علم کی چھاپ تھی، حیات اور وفات بھی علم کی راہ میں تھی، چھٹی کا تصور بھی نہیں تھا۔ عید کا دن گویا سب سے زیادہ تحصیلِ علم کا دن تھا۔ ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ روزن کھلا اور "تدوینِ حدیث" کے دریچہ سے علامہ مناظر احسن گیلانیؒ کی روح پکار اٹھی:۔

مبارک ہو، مبارک ہو! امام مالکؒ کی یاد تازہ کر دی ہے، امام مالکؒ، حضرت نافع اور شہاب زہریؒ سے تحصیلِ علمِ حدیث اور فائدہ اٹھانے میں ہمہ تن متوجہ تھے۔ ان کے گھر جاتے اور ان کے نکلنے کا انتظار کرتے تھے تاکہ حصولِ علم نہایت صحت اور سکون سے تکمیل کو پہنچ سکے۔ چنانچہ روایت ہے کہ عید آئی، امام مالکؒ نے سوچا کہ آج ایسا دن ہے کہ ابن شہاب زہریؒ خالی ہوں گے۔ عید کی نماز پڑھ کر لوٹے اور ان کے دروازے پر جا کر بیٹھ گئے۔

سُنا کہ ابن شہاب زہریؒ اپنی لونڈی سے فرمارہے تھے دیکھو دروازے پر کون ہے؟ لونڈی آئی! دیکھا اور واپس ہوئی اور ابنِ شہاب زہریؒ سے عرض کیا، آپ کا تابعدار شاگرد سرخ و سفید رنگ والا مالکؒ ہے۔ کہا اسے بلا لاؤ، چنانچہ بلادے پر امام مالکؒ داخل ہوئے ابن شہاب زہریؒ نے فرمایا، مالکؒ! تم عید کی نماز پڑھ کر گھر نہیں گئے؟ امام مالکؒ نے جواب دیا کہ نہیں! فرمایا تم نے کچھ کھایا بھی ہے؟ امام مالکؒ نے عرض کیا نہیں۔ فرمانے لگے کچھ کھالو، میں گھر سے بھیج دیتا ہوں۔ امام مالکؒ نے عرض کیا: جی نہیں، نہیں کھاؤں گا اس کی ضرورت نہیں۔ فرمانے لگے پھر کیا ارادہ ہے، کیسے آئے ہو؟ امام مالکؒ نے عرض کیا بس صرف حدیث پڑھنے آیا ہوں، سبق پڑھائیے فرمایا مالکؒ! کتاب لاؤ، مالکؒ کتاب لائے تو حضرت ابن شہاب زہریؒ نے چالیس حدیثیں بیان کیں اور ٹھہر گئے تو امام مالکؒ نے عرض کیا! حضرت کچھ اور احادیث بھی بیان فرمائیے ابن شہاب زہریؒ نے فرمایا یہی کافی ہیں اگر یاد کر لیں گے تو تمہارا شمار حفاظ حدیث سے ہو گا۔

امام مالکؒ نے عرض کیا حضرت! میں نے آپ کی ارشاد فرمودہ احادیث آپ کے بیان کرتے ہی یاد کرلی ہیں۔ ابن شہاب زہریؒ نے امام مالکؒ کے ہاتھ سے تختیاں لے لیں، اور فرمایا مالکؒ! یاد کی ہوئی احادیث سنائیے! امام مالکؒ نے سب حدیثیں سنا دیں۔ ابن شہاب زہریؒ نے ہونہار شاگرد کا یہ ذوقِ علم اور وفورِ حافظہ دیکھ کر فرمایا، عزیز جاؤ تم علم کے زبردست فقیہ ہو۔

ملاقات نمبر ۷

قلعی گروں کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے اربابِ علم و فضل [1] کا تذکرہ

ادارہ

الخیر کی مجلسِ تحریر کے معزز رکن فاضل دوست مولانا عبد القیوم حقانی رفیقِ مؤتمر المصنفین و استاذ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کا ایک وسیع سلسلہ مضامین صنعت و حرفت کا پیشہ رکھنے والے اکابر اہلِ علم کے تعارف و تذکرہ کے عنوان سے ماہنامہ الحق اور مرکزِ علم دار العلوم دیوبند کے ترجمان ماہنامہ دار العلوم میں بالاقساط شائع ہو رہا ہے جسے موصوف عبد الکریم سمعانی رحمہ اللہ کی شہرۂ آفاق تصنیف الانساب اور تاریخ کے مستند مآخذ سے مرتب کرتے ہیں..... چونکہ زیادہ تر اخذ و استفادہ کی بنیاد علامہ سمعانیؒ کی کتاب الانساب ہی ہے۔ اسلیے صاحبِ مضمون اپنے مقالہ کی ذیلی سرخی "علامہ سمعانیؒ سے ملاقات" قائم کر کے قارئین الخیر کو بھی حضرت سمعانیؒ کے فیوضاتِ عرفانی اور مجالسِ روحانی میں اپنے ساتھ لے چلتے ہیں۔ درج ذیل مقالہ اسی گرانقدر سلسلۂ تحریر کی ساتویں قسط ہے جو برادرم حقانی صاحب نے خصوصیت کے ساتھ قارئینِ الخیر ہی کیلئے عنایت فرمائی ہے۔ امید کہ قارئین اسے پسند فرما دیں گے اور صاحبِ مضمون آئندہ بھی یہ سلسلۂ عنایت جاری رکھیں گے۔ (محمد ازہر)

---

[1] یہ مضمون برادر محترم مولانا محمد ازہر مدیر ماہنامہ الخیر کی خدمت میں پہنچا تو انہوں نے درج بالا ادارتی تحریر کے ساتھ اپنے موقر جریدہ ماہنامہ الخیر مارچ ۱۹۸۶ء کے شمارہ میں شائع فرمایا۔

گذشتہ کئی ایک ملاقاتوں میں علامہ عبدالکریم سمعانیؒ سے ہم مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے اپنے اکابرینِ ملت اور مشاہیر اہلِ اسلام کا تذکرہ سنتے چلے آئے ہیں جو علم و عمل، کردار و فضل کے بلند ترین مقامات پر فائز تھے، جن کی عظمت اور قدر و منزلت کے چہار دانگِ عالم میں چرچے تھے جن کا نام سُن کر دنیا ان کی عظمت سے سر جھکا دیتی تھی جن کی ساری زندگی اور زندگی کی تمام صلاحیتیں دین اور علمِ دین کی خدمت و اشاعت کے لیے وقف تھیں، جو صرف اپنے نام سے لاکھوں کے دام حاصل کر سکتے تھے مگر انہوں نے علم کی آبرو اور دین کی عظمت کے رفیع اقدار کو دنیا کے پاؤں میں ذلیل اور رسوا نہیں کیا۔ ان کا ہر کام خدا کی رضا کے لیے تھا، ان کا ہر سانس سنتِ نبوی کے احیاء کے لیے تھا، اس لیے درس و تدریس اور خدمت و تبلیغ پر کبھی معاوضہ نہیں لیا۔ معاوضہ کا تصور بھی ان کے نزدیک گناہِ کبیرہ سے کم نہ تھا۔

علامہ سمعانیؒ سناتے رہے کہ انہوں نے برضا و رغبت بلکہ بڑے اشتیاق اور محبت سے موچیوں کا کام کر کے رزقِ حلال کمایا، نساجی کا کام کیا، روغن سازی اختیار کی، پارچہ بافی کے عمل سے اپنے اور اپنے خاندان کے لیے معاش کے وسائل پیدا کیے، شہد کی مکھیاں پال کر رزقِ حلال کمایا، حلال جانور ذبح کر کے گوشت بیچ بیچ کر خدمتِ خلق بھی کرتے رہے اور معاشی فوائد کے ساتھ آخرت بھی کماتے رہے۔

مجھے اس سے قبل چھ بار حضرت علامہ سمعانیؒ کی مجالسِ خیر و برکت میں حاضری کی سعادت نصیب ہو چکی ہے اور الحمدللہ کہ میں نے ان کی کسی بھی ملاقات کے موقع پر ان کے ارشادات، ہدایات اور تعلیمات کو ضائع نہیں کیا، ان کا پیغام محفوظ کر لیا اور قلم و کتابت اور خالقِ خداوندِ کریم کے فضل و عنایت سے ہزاروں تک پہنچا بھی دیا۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ تقدیر کا یہ فیصلہ (علامہ سمعانیؒ کی مجالسِ روحانی میں احقر حقانی کی حاضری و استفادہ) بے حد نافع اور مفید ثابت ہوا۔ علامہ سمعانیؒ کے فیوضات اور افاداتِ روحانی آج بھی انقلاب انگیز وجد آفریں اور ایمان و یقین کا زندہ پیغام ہیں۔

علامہ سمعانیؒ کی مشہور کتاب "الانساب" سے جتنا بھی قرب و تعلق، مطالعہ، تحقیق، تحصیلِ علم اور استفادہ کا تعلق بڑھتا گیا اتنا ہی اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے نورِ ایمان، عملِ صالح،

خدمتِ دین، ذوقِ تدین، شوقِ تحریر، وحدتِ ملّت، اتحادِ امت اور خدمتِ اسلام کے جذبات اُبھرتے رہے۔ یہ سب کچھ دینِ اسلام کی صداقت، اہلِ اسلام کی کرامت، نبوت کا معجزہ اور تعلیماتِ قرآن کی حقانیت کی دلیلیں ہیں جو کردار و عمل اور سیرت و اخلاق کی انقلاب آفریں جھلکیوں کی صورت میں قارئین کے سامنے اس سے قبل چھ قسطوں میں آچکی ہیں۔ آج ساتویں بار ان کی مجلس میں باریابی کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔

شاید کوئی کہہ دے یا شیطان یہ وسوسہ ڈال دے کہ علامہ سمعانیؒ کی مجالس میں ہم چھوٹے لوہاروں، پارچہ بافوں، روغن سازوں، نساجوں اور قصابوں کے حالات و واقعات اور ان کے آثار و سوانح اور افکار و کردار کے مسلسل تذکروں سے تم نے کیا پایا؟ مجھے یقین ہے اور قارئین بھی میرے ساتھ اس تاثر میں شریک ہوں گے کہ ہم نے یہ سبق ضرور سیکھ لیا کہ ہمارے اسلاف بلڈنگ، بینک بیلنس، موٹر گاڑیاں، سرمایہ جائیداد، وزارت حکومت یا فانی دنیا کی زوال پذیر جاہ و منزلت نہ بنا سکے، مگر دنیا کے بجائے آخرت، جہالت کے بدلے ہدایت، ظاہر کے بجائے باطن اور یقین سے معمور اور نورِ ایمان سے بھرپور راہوں کو اپنایا، دنیائے فانی کی لذتوں پر آخرت کے باقی اور لافانی اکرامات کو ترجیح دی اور اس راستے اللہ تعالیٰ کی بخشش و کرم اور اس کی بے انتہا رحمتوں کے مستحق ٹھہرے اور امت کی ہدایت کے نشانِ راہ قائم فرمائے علامہ سمعانیؒ کے کرم و عنایت، توجہ و شفقت، ارشاد و ہدایت کے صدقے یقین بن چکا ہے اور تمام اہلِ اسلام کا یہی یقین ہونا چاہیئے۔ نیز قرآن و سنت کی تعلیم، اسلام اور اہلِ اسلام کی تاریخ کا مطالعہ بھی یہی بتاتا ہے کہ دینِ اسلام ایک عالمگیر دین اور امتِ محمدیہ آخری اور عالمگیر امت ہے، زمانہ کے تغیرات و انقلابات کے پیشِ نظر، قدرت کی طرف سے اس دین کو معجزانہ طور پر ہر دور میں ایسے زندہ اشخاص (خواہ وہ کسی بھی خاندان، قبیلے اور پیشے سے تعلق رکھتے ہوں) عطا ہوتے رہے۔ جنہوں نے تعلیماتِ اسلام کو زندگی میں منتقل کرنے اور اجتماعی و انفرادی طور پر اس دین کو تازہ اور سدا بہار رکھنے کے لیے افرادِ امت کو سرگرم عمل رکھا خود فقر و فاقہ برداشت کیا، محنت اور مشقت کی راہ اختیار کی، اپنے خون پسینہ سے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالا مگر اسلامی تعلیمات کی اشاعت اور خدمتِ دین میں ضمیر اور آبرو کو نہیں بیچا۔

اسے امیروں اور وزیروں کے درباروں کی بھینٹ نہیں چڑھایا، مزدوری کی، انسانی خدمت کے مختلف پیشے اختیار کیے، پیشہ کو ذلت نہیں عزت بنایا اور اس راہ سے اخلاق و کردار اور تعلیمات کے ایسے نمونے انسانیت کے سامنے پیش کیے کہ نوعِ انسانی کے ہزاروں افراد تسبیح کے دانوں کی طرح اسلام کے مسلکِ توحید میں ڈھلتے گئے اور اسلام کی عظمت کا سکہ جمتا گیا۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا کی تمام قومیں اور اُمتیں، امتِ محمدیہ کے انقلاب آفریں پیغام اور مردم خیزی کی کوئی نظیر پیش نہیں کر سکتے۔ اہلِ اسلام کے غریب مزدور غلام، محنت کش اور پیشہ ور طبقہ سے تعلق رکھنے والے ہر دور میں ایسے افراد پیدا ہوتے رہے جنھوں نے علم میں کمال حاصل کیا شب بیداری، محنت و خواری اور اخلاص سے قدرت کے غیبی خزانوں سے علم کے جواہرات میں اپنا استحقاق پیدا کیا، پھر انہیں قدرت نے ان کے اخلاص اور خدمتِ نوعِ انسانی اور رزقِ حلال کی بدولت ایسے ملکہ سے نوازا جس کی برکت سے انہوں نے دینِ اسلام سے متعلق ہر قسم کی تحریفات، تاویلات، بدعات، عجمی اثرات، مشرکانہ اعمال و رسوم، الحاد و لادینیت، مادیت اور عقل پرستی کا پردہ چاک کیا۔

حقیقتِ اسلام کو اُجاگر کیا، سنّت کی پُر زور حمایت کی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جوتے خود گانٹھے تھے تو انہوں نے جوتے گانٹھنے کے عمل کو ترویج دی اور نیک نیتی سے اس سنّت کے احیاء کے بدلے سینکڑوں شہیدوں کا ثواب حاصل کیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھوں سے حلال جانوروں کو ذبح فرمایا تھا تو انہوں نے اس عمل کو بطورِ پیشہ وکسبِ حلال اختیار کر کے نیک نیتی سے کام کیا، سنّت بھی زندہ ہوئی، انسانیت کی خدمت بھی ہوئی۔ خلق کی نیاز مندی سے نجات ملی، خالق کی نیاز مندیوں کا اعزاز حاصل ہوا۔ لہٰذا جابر سلاطین کے سامنے کلمۂ حق بلند کرنے میں ان کے لیے کوئی دنیوی لالچ روک نہ بن سکی۔

انہوں نے اسلامی تعلیمات کی درس گاہیں کھولیں، تدوین و تشریح کے عقدے حل کیے، گذشتہ چھ قسطوں میں جن اعاظم رجال کا تذکرہ آیا ہے آپ ان میں سے ایک ایک فرد کے شخصی کردار، انفرادی سیرت اور پھر اجتماعی نظام اور معاشرتی اعمال پر انگلی رکھ رکھ کر، اور ٹٹول ٹٹول کر غور فرما دیں، تنقید کی نگاہ سے دیکھیں، تحقیق کی راہ سے چلیں، آپ کو بھی یہ یقین کرنا پڑے گا کہ

امت کے یہ افراد پیشہ و عمل، معاشی وسائل اور قومی نسب و نسبت کے لحاظ سے مغربی تہذیب کے مریض، کج بینوں اور ذات پات کی لعنتوں سے متاثر بعض کور نگاہوں کی نظر میں بظاہر گرے ہوئے پسماندہ، گھٹیا اور بے وقار سہی ـــ مگر عقلمندوں، داناؤں، خدا کے صالح بندوں، انسانیت کے قدردانوں، باضمیر لوگوں، علماء، صلحاء اور خود خدا تعالیٰ کی نظر میں ان کا مقام بلند اور ان کا نام و کلام اور پیغام زندہ ہے ؎

نظر اُن کی ہو میری جانب
زمانہ پھر جدھر چاہے اُدھر ہو

تاریخ کے صفحات، ذرہ ذرہ کائنات اور علامہ سمعانیؒ کا ہر صفحۂ الانساب اس کا شاہد ہے کہ امت کے یہ افراد دماغی، علمی، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اپنے زمانہ کے ممتاز ترین افراد تھے، ان کے پاکیزہ اور بے باک کردار نے ان کی شخصیتوں کو طاقتور اور ان کی تعلیم و پیغام کو دلآویز بنا دیا تھا۔

ذی الحجہ ۱۴۰۶ھ کی گیارہویں تاریخ ہے۔ علامہ سمعانیؒ کی خدمت میں آج تیسرے روز بھی حاضری کا شرف حاصل رہا۔ موصوف میری خلافِ معمول سہ روزہ مسلسل حاضری پر متعجب اور حیران بھی تھے، زبانِ حال سے ارشاد فرمایا کیوں؟ تمہارا ہمیشہ کا معمول بدلا ہوا نظر آتا ہے تمہاری حالت تو یہ تھی کہ چھ، سات ماہ تک ملاقات کا موقعہ ہی نہیں ملتا تھا اور اب حالت یہ ہے کہ تیسرے روز سے واپسی کا نام نہیں لیتے۔

میں نے عرض کیا حضرت! اس سے قبل "دفاعِ امام ابوحنیفہؒ" کے کام میں مصروف تھا، ۱۳ ابواب پر مشتمل ۲۵۲ صفحات کی یہ کتاب مؤتمر المصنفین دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کی طرف سے ایک عظیم علمی پیشکش کی صورت میں منظرِ عام پر آگئی ہے، چونکہ تصنیف کا کام مطالعہ و یکسوئی اور پوری توجہ چاہتا ہے اس لیے آپ کے ہاں حاضری میں بھی طویل غیر حاضری ہو گئی۔

ارشاد فرمایا! بہت اچھا کیا، امام اعظم ابوحنیفہؒ بھی ہمارے موضوع سے خارج نہیں ایسے اکابر کا دفاع تو ہمارا دینی اور ایمانی فریضہ ہے۔ امام ابوحنیفہؒ تدوینِ فقہ اور اسلام کے

دستوری خاکے کے اوّلین مدوّن ہیں۔ عبادت و ریاضت اور شبانہ روز فکر و مراقبہ کے ساتھ ساتھ فقہ و آئین کی ترتیب، احباب و رفقاء اور تلامذہ سے مشاورت کے علاوہ سیاسی لائحہ عمل، حکمتِ عملی اور پورے ملکی سطح پر عظیم، وسیع اور ہمہ گیر کپڑا فروشی کا کاروبار کرتے تھے، بزاز تھے، اور کپڑے کی تجارت میں نئی نئی راہیں پیدا کر چکے تھے۔ یہ سارا دھندا اس لیے کرتے تھے کہ حکومت کے ترلقموں سے خود کو محفوظ رکھیں اور نادار طلبہ، اساتذہ اور محدثین و علماء کی خدمت کر سکیں۔

ارشاد فرمایا: اس عظیم شخصیت، اسلام کے ہیرو، اسلامی آئین کے اوّلین مدوّن، فقہ و قانون کے مجتہدِ اعظم کا دفاع امت کا فرض ہے۔ تم اچھے شغل میں لگے رہے کہ افرادِ امت کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر دیا۔ اب جو یہ کتاب منظرِ عام پر آ رہی ہے یہ خدا کا فضل ہے اساتذہ کی دعائیں ہیں۔ استاذ العلماء محدثِ کبیر شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ کا فیضِ صحبت اور توجہ و عنایت ہے، اس پر ناز نہ کرنا، یہ امام ابوحنیفہؒ کی اپنی کرامت ہے خدا تعالیٰ قبولیت فرمائے۔

ارشاد فرمایا، صرف امام ابوحنیفہؒ ہی نہیں ہماری تاریخ کا ہر ورق روشن ہے مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے ہمارے اسلاف کے پاکیزہ کردار کا ہر عنوان نمونۂ عمل ہے، ان کی ہر روش دعوتِ فکر اور ان کی ہر ادا دعوتِ ایمان ہے۔

آپ کو حیرت ہوگی کہ ہمارے اسلاف میں قلعی گروں کے خاندان بھی علم کے گہوارے دین کے متوالے اور علومِ نبوت کے ہالے بنے رہے۔ صیقل گری (قلعی کرنا) ان کا پیشہ تھا مگر تحصیلِ علم اور تدریس و اشاعتِ دین ان کی عبادت تھی، علم سے تلبس پر ان کو فخر تھا۔ یہی ان کے خاندان کا طرۂ امتیاز اور اس سے وابستگی ان کے لیے مایۂ ناز تھی۔

ارشاد فرمایا، "الانساب" کے صفحہ ۳۵۸ اور صفحہ ۳۵۹ پر نظر دوڑائیے۔ احقر نے آج کی بحث و ہدایت کا عنوان اور موضوعِ گفتگو کی شہ سرخی پڑھی، جلی حروف کے ساتھ لکھا تھا: "الصیقل" عنوان سے گفتگو کی تفصیلات کا اندازہ ہو گیا کہ صیقل عربی زبان میں قلعی گر کو کہتے ہیں۔ آج حضرت علامہ سمعانیؒ قلعی گروں کے عبرت آموز واقعات اور حیرت انگیز کہانی

سُنانے کے موڈ میں ہیں، غنیمت سمجھا اور دامن دل و دماغ پھیلا دیا۔

ارشاد فرمایا: قلعی گروں کے علمی خاندان جس طرح برتنوں کو مانجھ مانجھ کر قلعی سے چمکاتے اور اس سے اپنے معاشی وسائل کماتے، اسی طرح انہوں نے باطنی و روحانی اور علمی طور پر بھی زنگ آلود دلوں اور بے رونق روحوں کو اپنے علوم و معارف اور روحانی توجہ کے صیقل سے مانجھا اور اپنے علمی و دینی، تعلیمی و تدریسی، تحریری و تصنیفی صیقل گری سے ان کو چمکایا، معاشی گذر اوقات کے وسائل بھی کمائے اور آخرت کو بھی بنایا۔

نصر بن عبد الملک کا تعلق قلعی گروں کے خاندان سے ہے۔ ابو سہل کنیت ہے مزنی اور بلخی نسبتوں سے ان کا تذکرہ ہوتا ہے مگر پیشہ کی نسبت سے زیادہ معروف ہیں ان کے نام کے ساتھ صیقل (قلعی گر) گویا ان کے نام کا جزو بن گیا ہے، ان کا اصل نام عبد الکبیر ہے۔

علامہ سمعانیؒ نے فرمایا: موصوف کو خدا نے بچپن ہی سے تحصیلِ علم کا شوق اور مطالعۂ کتب بینی کا ذوق عطا فرمایا تھا، چونکہ طلب صادق تھی اس لیے قدرت کی طرف سے تحصیلِ علم کے راستے بھی آسان ہوتے رہے۔ عبد الکبیر قلعی گر نے حصولِ علم کی خاطر بڑے بڑے اکابر اساتذۂ حدیث اور فقہ و قانون کے ماہرین کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔

آپ کے مشہور اساتذہ میں امام اعظم ابو حنیفہؒ، امام سفیان ثوریؒ اور امام جعفر صادقؒ کا نام سرِ فہرست ہے۔ اس کے علاوہ بھی علامہ سمعانیؒ آپ کے متعدد اساتذۂ کرام کا تذکرہ فرماتے رہے۔ ارشاد فرمایا کہ محمد بن عجلانؒ ہشام بن عروہ ہشام بن حبان، معسر بن کدام اور شعبہ بن الحجاج جیسے یکتائے روزگار شخصیتوں کے درسی حلقوں میں عبد الکبیر قلعی گر نے باقاعدہ حاضری دے کر کسبِ فیض کیا اور فن کی تحصیل و تکمیل کو اتمام تک پہنچایا۔

طالب علمی سے فارغ ہوئے تو اساتذہ نے آپ پر اعتماد کیا اور آپ کو باقاعدہ درس و تدریس، فتویٰ اور تقریر و تحریر کی اجازت مرحمت فرمائی۔ آپ نے ان امور کو للہ فی اللہ دین کی خاطر اور صرف خدا ہی کی رضا کے لیے فی سبیل اللہ بغیر کسی معاوضہ کے انجام دیا ضروریاتِ زندگی کی تکمیل اور رزقِ حلال کی تحصیل کے لیے قلعی گری کا کاروبار اختیار کیا اور

زندگی بھر اسے جاری رکھا۔

آپ نے جس محنت و لگن، مشقت اور شفقت سے طلبہ کو علوم نبوت منتقل کیے اس کا اندازہ آپ کے تلامذہ کی فہرست سے لگایا جا سکتا ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ شیخ اور استاذ کی قابلیت تلامذہ کی رائے و ازدہام سے معلوم ہوتی ہے۔ علامہ سمعانیؒ نے اسی مجلس میں عبدالکبیر قلعی گر کے تلامذہ جو علم و فن اور دینی و علمی قدر و منزلت کے لحاظ سے ممتاز مقام پر فائز ہوئے، میں سے چند ایک کی نشاندہی فرمائی۔ مسلم بن مقاتل، ازہر بن یونس، ابواسحٰق الطالقانی جیسے اکابرو اعاظمِ علوم و فنون آپ ہی کی درسگاہ کے فیضیافتہ اور آپ ہی کی روحانی تربیت کے پروردہ ہیں۔

عبدالکبیر قلعی گر کا تذکرہ جاری تھا کہ کسی طرح ابو غالب محمد بن غالب جرجانی قلعی گر کے تذکرہ کی راہ پیدا ہو گئی۔ نام آتے ہی یوں معلوم ہوا جیسا کہ حضرت سمعانیؒ کے جسم میں مٹی جان آ گئی ہو گویا انہیں برسوں کا منتظر محبوب مل گیا چونکہ ان کا مزاج عالمانہ، مربیانہ اور کیف و مستی کے لحاظ سے عاشقانہ ہے، یوں محسوس ہوا گویا ذکرِ حبیب سے وصلِ حبیب کی لذتیں حاصل کر رہے ہیں کہ ؏

ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

ارشاد فرمایا: ابو غالب قلعی گر گو وطن کی نسبت سے جرجانی تھے مگر عبدالکبیر قلعی گر کی طرح پیشے (قلعی گری) کی نسبت سے زیادہ مشہور تھے۔ ابو غالب قلعی گر ایک نیک سیرت انسان اور ظاہر و باطن کے لحاظ سے یکساں تھے۔ طالب علمی کے زمانہ سے ذکر و فکر، تلاوت و عبادت، توجہ و انابت، عملِ صالح اور تقویٰ و طہارت کا رجحان اور میلان غالب تھا طلبہ میں بھی ان ہی اوصاف سے مشہور تھے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ زمانہ طالب علمی میں عمل کے لیے خدا کی نصرت زیادہ شامل ہوتی ہے، وہ جو کچھ پڑھتے تھے فوراً اس پر عمل کر کے دکھاتے تھے۔ ان کی ثقاہت نیکی اور دیانت کی ایک دنیا قائل تھی۔ تحصیلِ علم سے فراغت کے بعد تو ہمہ تن اعمال، تربیت، تبلیغ اور تعلیم و ارشاد میں مصروف ہو گئے۔

ان کے انہماک سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پیدا ہی اسی کام کے لیے ہوئے ہیں۔ دنیا کی چالاکیوں، مکر و فن، حیلہ جوئی اور بہانہ سازی سے ناآشنا تھے، سیدھے سادے سچے اور پکے

مسلمان تھے۔ ہر انسان کی قدر کرتے اور ہر ایک سے حسنِ ظن کا معاملہ فرماتے۔ یہی وجہ ہے کہ حسنِ اخلاق، تواضع، انکساری، مہمان نوازی، غریب پروری اور انسانی ہمدردی میں اپنے زمانہ میں اپنی مثال آپ تھے۔ شہرِ دامغان ان کا آبائی وطن تھا مگر وہاں سے کرمان منتقل ہوئے تو یہیں کے ہو رہے۔ تزکیۂ قلوب اور صفائیِ باطن پر زبردست محنت کی، اہلِ کرمان نے انہیں اپنا شیخ تسلیم کیا اور تمام کرمانی صوفیائے کرام کے شیخ قرار پائے، نیز تحصیل و تکمیلِ علم کے لیے آپ نے جرجان نیشاپور اور اصفہان کے متعدد اسفار بھی کیے۔

ابوغالب قلعی گر کے اساتذۂ حدیث میں ابوالقاسم اسمٰعیل، ابوالفتح مظفر، ابوالقاسم الفضل، ابوالمظفر موسیٰ، ابوعمر، عبدالوہاب اور ابومسعود سلیمان زیادہ مشہور ہیں۔ تلامذہ اور آپ سے استفادہ کرنے والوں کا ذکرِ خیر بھی علامہ سمعانی رحمۃ اللہ علیہ لے لے کر بیان فرماتے رہے مگر وقت کی قلت اور خوفِ طوالت کے پیشِ نظر ہم یہاں ان کا ذکرِ خیر نہیں کر پائے۔

قلعی گروں کی اس طویل فہرست میں تیسرے نمبر پر ابویوسف حجاج ابوزینب قلعی گر کا تذکرہ فرمایا ان کے بعد ابوالحسن علی بن احمد قلعی گر، ابومنصور محمد بن عبداللہ قلعی گر کا ذکرِ خیر فرماتے رہے اور قلعی گروں کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے مختلف مشاہیر اور علماء اسلام کے اوصاف اور حالات و کمالات کا بیان جاری تھا۔

میں تو حیرت و استعجاب سے دم بخود تھا کہ بار الٰہا! آپ نے کیسے کیسے لوگ پیدا کیے تھے، ان کے اوقات میں کتنی برکتیں تھیں، ان کے ظرف میں کتنی وسعتیں تھیں "الانساب" میں حضرت سمعانی رحمۃ اللہ علیہ سے جب ان کے مراتبِ روحانی و مدارجِ عرفانی کے حیرت انگیز اور ایمان آفرین تذکرے سنے تو یقین میں اضافہ ہوا، ایمان میں قوت اور تازگی پیدا ہوئی اور اس یقین میں مزید اضافہ ہوا کہ زمین میں جو لوگ بڑے کام کرتے ہیں اُن کی اس سعادت کے فیصلے آسمان میں پہلے سے ہو چکے ہوتے ہیں، جو کچھ بھی ہوتا ہے خدا کے فضل اور انتخاب سے ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ پیشہ کو نہیں دیکھتے، قلعی گری اور مزدوری اس کے انتخاب کے لیے مانع نہیں بن سکتی مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے مشاہیرِ اہلِ اسلام کے تذکرے قلعی گروں کے کارہائے نمایاں پر حضرت سمعانی رحمۃ اللہ علیہ کے تبصرے اور تاریخِ انسانیت کے صفحات اس امر پر گواہ ہیں کہ جب دین پر

پردے ڈال دینے کی کوششیں کی جا رہی تھیں، جب حقانیت کا چراغ گل کر دینے کے نامسعود مساعی کے منصوبے بنائے جا رہے تھے، جب علوم نبوت کو جاہلی معاشرے اور عیش و عشرت کے دلدادوں نے مٹانے کے فیصلے کر لیے تھے۔ ایسے حالات میں اللہ کریم نے درزیوں، لوہاروں، موچیوں، ریشم سازوں، قصابوں اور قلعی گروں کے خاندانوں میں ایسے ایسے جلیل القدر علماء، فقہاء، مجتہدین، مفسرین، محدثین، اساتذہ اور ان کے تلامذہ، مبلغین و مصلحین اور مجاہدین کی زندہ، جری اور طاقتور شخصیتیں پیدا فرمائیں جنہوں نے دین اور اسلامی حدود و قوانین سے آزادی کے غلط رجحانات کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کیا، امت میں ایمانی روح پیدا کی، اللہ تعالیٰ کے دین و احکام کی طرف دعوت دی۔ فقہی و قانونی اور آئینی نقطۂ نظر سے قرآن و حدیث کے ذخیرے سے فقہی دبستانِ اربعہ کے اصولوں کی روشنی میں اجتماعی نظام کے خطوط متعین کیے۔ دینِ اسلام پر اس کے اصول و ماخذ اور اس کی ہدایات و تعلیمات پر اور اس کی تعبیرات پر اعتماد کو از سرِ نو استوار کیا۔ مزدوری، مشقت اور وسائل معاش بقدرِ کفاف کمانے سے جو وقت بچتا اس کی قدر کرتے، ان اوقات میں تعلیم و تدریس، تصنیف و تحریر، تبلیغ و اشاعتِ دین کے منصوبے بناتے، انہوں نے وقت کے لمحات کو قیمتی بنایا اور اس کی قدر کی لہٰذا کامیابیوں نے ان کے قدم چومے۔

چنانچہ ان کی محنت و جدوجہد اور شب بیداریوں کی برکت سے دین و مصادرِ دین اور اسلام کی حقیقی فکر کی حفاظت ہوتی رہی۔ انہوں نے تعلیمِ نبوت کو عام کر کے امت کو نئے فتنوں میں پڑنے سے باز رکھا، امت کی اجتماعی اور سیاسی قوت کی حفاظت کی تاریخی روایات و اقدار کو اجاگر کیا، اپنی حکیمانہ دعوت و ارشاد اور سیاست و تدبیر سے امت کے شیرازہ کو مجتمع کیا۔ اپنے تلامذہ متعلقین مسترشدین اور عامۃ المسلمین کی تربیت کی، رجال کار پیدا کیے۔ صرف یہ نہیں بلکہ علمی و روحانی ترقیات کے ثریا پر کمندیں ڈالیں، سلاطین و حکام اور معاشرہ کا عام احتساب کیا، شکوک و شبہات کے جوابات دیئے، فتنوں کی سرکوبی کی۔

آج حضرت العلامہ عبدالکریم سمعانیؒ کی ہدایات و تعلیمات اور روح پرور ارشادات کا مرکزی مضمون نیز ان کے تاریخی، علمی اور روحانی فیوضات کا جوہر یہی تھا کہ۔۔

"اگر یہ حضرات قربانیاں نہ دیتے، مختلف پیشوں اور قلمی گری کے پیشہ سے تعلق رکھنے والے مشاہیر اہلِ اسلام کا کردار نہ ہوتا تو اسلامی دستور، فقہی قوانین، عالمانہ تحقیقات، محدثانہ تشریحات، آئینی ضابطے، قانونی اصول و کلیات کا وسیع اور عظیم مجموعہ کماحقہ ہم تک نہ پہنچ پاتا۔"

علامہ سمعانیؒ سے متعدد بار ملاقات ہوئی اور اب کے بار، ساتویں بار بھی خدا کے فضل سے ان کے ہاں باریاب ہوا۔ افادات سنے، ضبط کر لیے اور خدا کی توفیق سے قارئین تک پہنچا بھی دیئے۔ ساتؔ قسطیں آپ کے سامنے ہیں، آپ کا جو تاثر بھی ہو سو ہو میرا تاثر تو یہی ہے کہ:۔

"مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے ارباب علم وفضل اور مشاہیر اہلِ اسلام کا ہر فرد اسلام کی کسی نہ کسی سرحد کا محافظ اور اسلام کے ترکش کا ایک تیر تھا جو جہاں بھی لگا درست لگا اور نشانہ پر ٹھیک بیٹھا۔"

ملاقات نمبر ۸

کتابت کے پیشہ سے تعلق رکھنے والے ارباب فضل و کمال

اپنا ہمیشہ کا یہ معمول بنا لیا ہے کہ جب طبیعت میں اضمحلال، ضعف یا انقباض کی کیفیت وارد ہوتی ہے تو اسلافِ اُمّت بالخصوص اکابر علماء دیوبند کے ایمان افروز واقعات اور ان کے حالات و سوانح کا مطالعہ شروع کر دیتا ہوں جس کی برکت سے فرحت و انبساط، سرور روحانی برکات اور اکابر کے کارہائے نمایاں کے انوار سے قلب و باطن یقین کے نور سے مسرور اور نیکی کے عزائم سے معمور ہو جاتے ہیں ؎

احب الصالحین ولست منہم
لعل اللہ یرزقنی صلاحاً

تاریخ کے اس مبارک موضوع اور روشن و مؤثر باب میں تذکرۃ الرشید، سوانح قاسمی، اشرف السوانح، سیرت سید احمد شہید، تاریخ دعوت و عزیمت، نقشِ حیات، حیاتِ امیرِ شریعت، حیاتِ خلیل، سوانح عبد القادر رائے پوری، حیاتِ انور، حیات شیخ الہند، تذکرہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی، آپ بیتی، سوانح مولانا الیاس اور سوانح مولانا محمد زکریا احقر کی محبوب مطالعاتی اور پسندیدہ کتابیں ہیں۔ جب چاہتا ہوں کسی ایک صاحبِ تذکرہ و سوانح کی بارگاہِ علم و اخلاص میں حاضر ہو جاتا ہوں۔ تحصیلِ علم کے آداب سے ناواقف سہی! اہلِ علم کی زیارت و ملاقات اور مجالس و صحبت کوئی کم نعمت نہیں۔ اور الحمد للہ کہ نیاز ازل اس کے لیے نماط خواہ اہتمام کی

توفیق ارزانی بھی عطا فرما دیتے ہیں سے

تیری طلب بھی کسی کے کرم کا صدقہ ہے
یہ قدم اٹھتے نہیں ہیں اُٹھوائے جاتے ہیں

ربیع الثانی ۱۴۰۷ھ کی بیسویں اور دسمبر ۱۹۸۶ء کی تیئسویں تاریخ ہے۔ کثرتِ کار اور ہجومِ افکار سے طبیعت اُکتا گئی، دارالعلوم کے ضروری کاموں سے فارغ ہُوا تو اپنی مطالعہ گاہ میں آیا۔ سوانح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ پر نظریں جم گئیں، کتاب اٹھائی تو حسنِ اتفاق سے چند نازک امتحانات کا عنوان دل کو بھایا، پڑھتا ہی چلا گیا۔ دس صفحات پر مشتمل یہ مضمون پڑھنے سے فارغ ہُوا تو یوں محسوس ہُوا گویا کسی نے طاقت کا ٹیکہ لگا دیا ہے یا ضعف و علالت کے بستر سے اٹھا کر صحت و نعمت اور بہاروں کی فضاؤں میں پہنچا دیا ہے۔

اپنی بے ہمتی، ضعفِ عمل، کوتاہی، غفلت اور سُستی پر بے حد شرم اور ندامت محسوس ہوئی۔ قارئین کی دلچسپی و افادہ کے لیے اس سے ایک دو واقعے بھی نقل کیے دیتا ہوں۔

مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ حدیث کی مشہور کتاب ابوداؤد شریف بڑی محنت اور قابلیت سے پڑھا رہے تھے کہ حیدر آباد سے خط آیا جس میں لکھا تھا کہ "دائرۃ المعارف" میں بیہقی کے اسماء الرجال پر مستقل تالیف کا فیصلہ ہُوا ہے، مجلس نے دو فاضلوں کا انتخاب کیا ہے، ایک علامہ انور شاہ کشمیری کا اور دوسرا آپ کا۔ تاہم دائرہ کا رجحان آپ کی طرف زیادہ ہے۔ آٹھ سو روپیہ تنخواہ، سرکاری موٹر، مکان، ڈیوٹی چار گھنٹے، کتب خانہ آصفیہ وقف، مزید مراعات حسب منشاء۔ مگر حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ نے شدید مقروض ہونے کے باوجود سہارنپور کی ماہانہ تنخواہ بیس۲۰ روپے، فقر و درویشی اور صحبتِ استاذ کو اس پر ترجیح دی اور جواب میں لکھ دیا ع

مجھے جینا ہی نہیں بندۂ احسان ہو کر

مدرسہ عالیہ کلکتہ سے ۱۲۰۰ روپے تنخواہ کی پیشکش ہوئی۔ بخاری و ترمذی پڑھانے اور شیخ الحدیثی کا منصب اس پر مستزاد۔ جواب میں لکھا یہ آپ کا حُسنِ ظن ہے یہ ناکارہ اس کا اہل نہیں ـــ اس کے پس منظر میں اپنے استاذ کا فراق اور خدمت کے چھوٹ جانے کا

اندیشہ تھا جس کے لیے وہ ہرگز تیار نہ تھے۔

احقر دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ بارِ الٰہا! نہ جانے یہ کیسے لوگ تھے، کتنے باہمت، جفاکش، شانِ عبادت اور تقویٰ وللٰہیت اور عشق و محبت میں سرمست، کتنے بڑے کام کر گئے، اسباب کا فقدان ہے، وسائل موجود نہیں، غربت وافلاس اس پر مستزاد مگر عزائم جواں تر گویا ستاروں پر کمند ڈال رہے ہیں۔ بڑی بڑی اکیڈمیوں کا کام اور انجمنوں کا نظام جس چیز کو بطریقِ احسن انجام تک نہ پہنچا سکا، اللہ کے اس ایک بندے نے پورا کر دکھایا۔ بہت سوچا، کھوج لگائی، تہوں میں جھانک جھانک کر دیکھا، یہی سمجھ پایا کہ ان کی نظریں غیر اللہ پر نہ تھیں صرف اللہ پر تھیں، وہ دنیا کے داد و دہش اور نقد و زر و انعام کے متمنی نہ تھے، انہیں صرف اور صرف اللہ کی رضا سے کام تھا۔ قرضوں کے بوجھ سے لدے، فقر و غربت اور افلاس و ناداری کی تیز و تند موجوں سے ٹکرائے مگر پائے استقامت میں لغزش نہ آئی۔ دستِ سوال بارگاہِ صمدیت کے بغیر کہیں بھی نہیں پھیلایا اور جبینِ نیاز بے نیازِ خدا کی بارگاہِ الوہیت کے بغیر دوسری کسی بھی جگہ ذلیل نہیں کی ـــ کچھ یہی خیالات تھے، حسین تصورات تھے اور دل گنگنا رہا تھا ـ

اولئك آبائي فجئني بمثلهم
اذا جمعتنا يا جرير المجامع

کہ چشمِ تصور نے برصغیر کی سب سے بڑی اسلامی یونیورسٹی دارالعلوم دیوبند کے بانی و مہتمم قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی زیارت کرا دی۔ دسیوں کتابوں کے مصنف، سینکڑوں باکمال تلامذہ کے اُستاذ، ہزاروں مخلصین و مریدین کے پیشوا، عامۃ المسلمین کے قلوب کے بے تاج بادشاہ، اگر چاہتے تو سونے اور چاندی کے محل بنوا سکتے تھے مگر کسی کے بارِ منتِ احسان کو برداشت نہیں کیا۔ اپنے ہاتھوں سے رزقِ حلال کمایا۔ کتابت یا تصحیحِ کتب کا کام کرنے اس سے جو معاوضہ حاصل ہوتا اسی قوتِ لایموت پر گذر اوقات کرتے۔

اہلِ دنیا سے مستغنی اور بے نیاز تھے تو دنیا پاؤں پڑ کر منا رہی تھی۔ ایک مرتبہ کسی دنیا دار نے آپ کے شدید اعراض و انکار پر بھی روپوں سے بھری تھیلی آپ کی جوتیوں میں انڈیل

دی تو شاگرد سے فرمایا عزیز! جوتے جھاڑ دو۔ دیکھو! دنیا دار بھی دنیا کماتے ہیں اور ہم بھی دنیا کماتے ہیں، مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ دنیا دار دنیا کے پاؤں پڑتا ہے، دنیا کے سامنے جبین سائی کرتا ہے مگر دنیا اسے ٹھوکریں مار مار کر ذلیل کرتی ہے تب کچھ حصہ دے دیتی ہے، مگر ادھر یہ حال ہے کہ دنیا پاؤں پڑ رہی ہے اور ہم اسے ٹھوکریں مار مار کر ٹھکرا رہے ہیں۔

اسی سلسلہ کے ایک دوسرے بزرگ شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اپنے ہاتھ سے صابن بنایا کرتے تھے اور تصحیح کتب کا کام کر کے رزقِ حلال کماتے، اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال کر تبلیغِ دین، درسِ قرآن اور اعلاء کلمۃ الحق میں مگن رہتے۔

ہفتوں فاقے برداشت کیے، اپنا اور بچوں کا پیٹ کاٹا، نومبر دسمبر کی سردیاں نیلی چھت تلے گذار دیں مگر مشتبہ کھانے کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور نہ تن ڈھانپنے کے لیے کسی کے سامنے اشارۃً یا کنایۃً اپنی حاجت کا اظہار کیا۔ اور وہ کب کسی سے کہہ سکتے تھے اور کیسے غیر اللہ کے سامنے دامنِ سوال پھیلا سکتے تھے۔ بغیر اللہ تعالےٰ کے آخر ہے کون جسے حاجت روائی کا مقام حاصل ہو، ان کا قال اور حال ایک تھا، اکثر فرمایا کرتے۔

"غیر کے سامنے اپنی حاجت پیش کرنا خدا کی غیرت کو چیلنج دینا ہے،

شکایتِ حال شکایتِ ربِّ ذوالجلال ہے"

انہی کا قصہ ہے کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کی تحریکِ حریت کی حمایت، شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی رفاقت اور اکابر علماء دیوبند کے پیغام جہاد و حریت کی پاداش میں شیخ لاہوریؒ کو داھوں ضلع جالندھر میں قید کر دیا گیا، کھانے پینے کے لیے کچھ پاس نہ تھا۔ تن پر باریک کپڑے کا صرف ایک کرتہ تھا۔ نومبر دسمبر کی شدید یخ بستہ راتیں آپ نے اسی لباس میں گذار دیں۔ تھانے کے قریب کی مسجد میں آپ نماز پڑھا کرتے تھے۔ وہاں کے ایک صاحب یہ کہہ دیا کرتے "اگر آپ فرمائیں تو بستر لا دوں" مگر حضرت لاہوریؒ فرماتے اللہ جس حال میں رکھے راضی ہوں مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں" ہاں لے آؤ، کہنا چونکہ ایک گونہ سوال بن جاتا ہے، اس لیے سردی میں ٹھٹھر ٹھٹھر کر شب بھر کی بیداری برداشت کر لیتے تھے مگر سوال کی ذلت سے اپنے کو بچائے رکھا۔ انسپکٹر پولیس کی

ہدایت کے مطابق وہاں کے مسلمان سپاہی حضرت لاہوریؒ کے لیے کھانا پکا کر پیش فرماتے، مگر حضرت لاہوریؒ نے اس وجہ سے ان کے کھانے سے انکار کر دیا کہ پولیس والے اپنا کھانا پکانے میں رشوت کا ایندھن استعمال کرتے ہیں۔ پولیس کے سپاہی حیران تھے، سب انسپکٹر کو اطلاع دی گئی وہ بھی متحیر تھا کہ کھانے کو ان کے پاس تو کچھ ہے بھی نہیں، احمد علی رحمہ اللہ بھوکوں مر جائیں گے۔ مگر صبر و توکل اور صرف ایک اللہ سے جڑ جانے کا صدقہ کہ چند روز بعد ایک بوڑھی پارسا عورت مکئی کے بھنے ہوئے دانے اور کچھ گڑ دے جاتی، وہی آپ کا کھانا ہوتا۔

بہر حال ہمارے اکابر، اسلاف اُمت، علماء اور عارفوں نے اپنے ہاتھوں کی کمائی رزق حلال اور خون پسینہ سے جو کچھ کمایا اسے اپنا رزق بنایا اور علم دین کی عزت اور وقار کو غیر اللہ کی طرف للچائی نظریں اٹھا کر بٹہ نہیں لگایا۔

مزدوری کر کے رزقِ حلال کی کمائی، اکابر اہلِ علم اور اربابِ فضل کے فقر و فاقہ محنت و مشقت اور کتابت و تصحیح کتب کے پیشہ کے تصور نے مجھے اپنے قدیم محسن اور عظیم کرم فرما علامہ عبدالکریم سمعانیؒ کی علمی و روحانی درگاہ اور ان کے معروف دار العلم والفضل تک پہنچا دیا، دستک دی، تپاک، فرطِ اشتیاق اور شفقت و مہربانی کے جذبات سے معمور، بے تابانہ اور مضطربانہ انداز میں دروازہ کھولا تو "الانساب" کا صفحہ ۴۶۹ سامنے تھا۔ حرف "الکاف" کے نیچے "باب الکاف والالف" کی بغلی سرخی "الکاتب" پر نظر پڑی۔ واہ! گوہر مقصود مل گیا۔ جذبہ صادق ہو، طلب سچی ہو تو تقدیر موافقت کرتی ہے۔ قدرت کی یہ نیرنگیاں اور غیبی نصرتیں حسنِ طلب پر نہیں صدقِ طلب کے ساتھ موعود ہیں ؎

ہو حسنِ طلب لاکھ مگر کچھ نہیں ملتا
ہو صدقِ طلب پھر اثرِ آہ رسا دیکھ

اپنے مشائخ و اساتذہ کی مجالس، ارشادات اور فیوض و برکات سے بحمد اللہ یہ یقین پختہ ہو چکا ہے کہ اکابر علماء اور مشائخ و زعماء کے علمی تذکروں اور سوانحی خاکوں، علمی اور روحانی فیوض و برکات اور ان کے روح پرور واقعات میں جو لذت اور جذب و کشش ہے اس کی

اصل وجہ یہی ہے کہ انہوں نے خدمتِ دین اور اشاعتِ اسلام کو مقصدِ حیات بنایا خورد و نوش کے وسائل اور اسبابِ حیات اتنے اختیار کیے جتنے اِس مقدس مقصد میں ان کیلئے ضروری اور معاون ہو سکتے تھے۔ محرمات اور ممنوعات کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا علماء، اہلِ فضل کے لیے پیشۂ کتابت کوئی اجنبی بات نہیں۔

تاریخ نے تو اورنگ زیب عالمگیر کے قصّۂ کتابت کے دلچسپ واقعات بھی محفوظ کیے ہیں اور اس وقت اورنگزیب عالمگیرؒ کے کتابتِ قرآن کے تصور سے ہندوستان کے درویش اور فقیر منش سلطان ناصر الدین محمودؒ کی طرف ذہن منتقل ہو گیا۔ "منتخب التواریخ" نے لکھا ہے کہ ہندوستان کا یہ بادشاہ درویشانہ زندگی بسر کرتا تھا اور اس کی آمدنی کا ذریعہ صرف اور صرف قرآن مجید کی کتابت تھا۔ سال میں دو قرآن مجید کی کتابت کرتا اور ان ہی کے ہدیے سے اپنے گھر کے مصارف پورے کرتا اور اس کی کوشش یہ رہتی کہ بازار میں یہ بھی معلوم نہ ہونے پائے کہ یہ بادشاہ کا کتابت شدہ ہے کہ معلوم ہونے پر لوگ اس کو زیادہ قیمت پر خریدیں گے۔

اللہ اللہ! کیسے کیسے لوگوں کی یاد ستانے لگی۔ ناصر الدین محمودؒ بادشاہ تھا، پیشہ کے لحاظ سے کاتب تھا مگر سینہ اس کا عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے معمور تھا۔ غالباً "تاریخ فرشتہ" میں لکھا ہے کہ وہ اپنے دل میں جذبہ واحترامِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشِ نظر بغیر وضو کے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا نام زبان پر نہیں لاتا تھا۔ اس کے ایک خادم کا نام محمد تھا ضرورت پڑی تو ایک روز اس کو تاج الدین کہہ کر پکارا، سلطان کے اس انداز سے مصاحب کو خیال پیدا ہوا کہ شاید کسی وجہ سے سلطان اس پر ناراض ہے، اس لیے اس کو اپنے اصل نام (محمد) سے نہیں پکارا۔ اسی افسوس اور رنج کی وجہ سے وہ مصاحب تین روز تک دربار سے غیر حاضر رہے۔ سلطان نے ایک روز ان کو گھر سے بلا کر غیر حاضر رہنے کی وجہ دریافت کی تو مصاحب نے عرض کیا۔

"بادشاہ سلامت! آپ مجھے محمد کے سوا کبھی بھی کسی دوسرے نام سے نہیں پکارتے تھے اس روز خلافِ عادت "تاج الدین" کہہ کر مخاطب فرمایا، میں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ مزاجِ سلطانی میں خاکسار کی طرف

کوئی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔"

سلطان نے اس پر اصل حقیقت واضح کی اور قسم کھا کر یقین دلایا کہ اس وقت وہ بے وضو تھا، لہٰذا۔

شرم آمد کہ بے وضو نام محمدؐ بر زبان برآنم۔

مجھے شرم آئی کہ بغیر وضو کے نام محمدؐ زبان پر لاتا۔

ناصر الدین محمودؒ اس درجہ محتاط اور پاک طینت بادشاہ تھے کہ ایک پیسہ بھی بیت المال سے وصول نہیں کرتے تھے، وہی کتابتِ قرآن ذریعۂ معاش تھا۔ گھر کے تمام کام اس کی بیوی اپنے ہاتھوں سے انجام دیتی تھی، اور خود بھی اس کا ہاتھ بٹاتے۔ ایک روز بیوی نے عرض کیا کہ روٹی پکانے اور چولہے کے آگے بیٹھنے سے میرے ہاتھ جل جاتے ہیں۔ اگر خزانۂ شاہی سے ایک نوکرانی کا انتظام کر دیا جائے تو امورِ خانہ داری باحسن وجوہ انجام پائیں گے۔
ناصر الدین محمودؒ نے بیوی سے کہا :۔

بیت المال حق بندہ ہائے خدا است مرا نمے رسد چند روز بر محنت صبر کن کہ خدائے تعالےٰ فردائے قیامت اُمّنَا وَصَدَّقْنَا بہ اجر ایں مشقت حورے را بتو برائے خدمت خواہد داد۔

بیت المال بندگانِ خدا کا حق ہے یہ میری ملکیت نہیں ہے، اس محنت پر چند روز صبر کرو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز جس کا آنا یقینی ہے اس مشقت کے بدلے تمہاری خدمت کے لیے حور عطا فرماوے گا۔

بہر حال بات سلطان ناصر الدین محمودؒ کے پیشۂ کتابت کی چل رہی تھی۔ بات طویل ہوتی جا رہی ہے مگر کیا کیا جائے اسی سلسلۂ کتابت کا ایک واقعہ جسے "تاریخ فرشتہ" نے نقل کیا ہے صفحۂ قرطاس پر منتقل ہونے کے لیے مجبور کر رہا ہے۔ در اصل بات یہ ہے کہ موصوف اپنے کسی عمل و کردار اور قول و فعل سے کسی کے لیے جسمانی، ذہنی یا قلبی اذیت رسانی کا باعث بننے سے حتی الوسع اجتناب فرماتے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک قرآن مجید کسی دوست کو دکھا رہے تھے کہ اس نے ایک غلطی کی طرف اشارہ کیا، بادشاہ نے اسی وقت اس لفظ پر ایک دائرہ کھینچ لیا تاکہ بعد میں یہ غلطی درست کی جائے

جائے۔ لیکن جب وہ دوست چلا گیا تو سلطان نے وہ دائرہ مٹا دیا اور لفظ صحیح نہ کیا، ایک خادم جو یہ سارا قصہ دیکھ رہا تھا، دائرہ بنانے اور پھر تصحیح کیے بغیر اس کے مٹا دینے کی وجہ دریافت کی تو سلطان نے جواب دیا کہ میرا لکھا ہوا لفظ غلط نہیں تھا لیکن میں اس کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا، اس لیے دائرہ لگا کر اس کو یہ تاثر دیا کہ غلطی درست کرلی جائے گی۔ آخر میں فرمایا عزیز! کاغذ پر بنایا ہوا دائرہ مٹانا آسان ہے مگر کسی کے دل سے دکھ اور رنج کا نقطہ مٹانا آسان نہیں۔

بہر حال بات اپنے اسلاف، مشاہیرِ امت، اہلِ علم اور فقیر منش سلاطین کی چل رہی تھی کہ انہوں نے شب و روز محنت اور مزدوری کی، حتیٰ کہ خطاطی، کتابت اور تصحیحِ کتب جیسے صعب ترین، صبر آزما پیشہ کو اختیار کیا، اس سے جو کچھ حاصل ہوتا اسی قوتِ لایموت پر اکتفاء کرتے، یہی ذریعۂ معاش ہوتا اور ذریعۂ حیات بھی اور وسیلۂ اشاعت و تبلیغ بھی۔

علامہ سمعانیؒ نے ارشاد فرمایا:۔

اشتھر بھا جماعة الکتابة المعروفه۔	فنِ کتابت اور خطاطی کے پیشہ سے منسوب علماء اور ائمہ اسلام کی ایک جماعت کو شہرت حاصل ہوئی۔

مجھے تو اپنے اکابر علماء دیوبند کے تذکروں میں بعض بزرگوں سے متعلق معلومات تھیں کہ وہ کتابت، خطاطی اور کتابوں کی تصحیح کا کام کرکے قوتِ لایموت کماتے اور اس پر گذر اوقات کرکے خدمتِ دین و عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتے۔ جیسا کہ شروع میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا احمد علی لاہوریؒ کے ایک دو واقعے احقر نے نقل کر دیئے ہیں۔ مگر علامہ سمعانیؒ کی خدمت میں حاضری اور الانساب کے استفادہ سے معلوم ہوا کہ صرف ایک دو نہیں چودہ سو سال کی تاریخ میں شاید ہی کوئی وقفہ ایسا ہو جس میں ہمارے اسلاف اور علماء اسلام نے اس پاکیزہ پیشہ سے وابستہ رہ کر خدمتِ دین اور علمِ اسلام کی بالادستی کا کام نہ کیا ہو۔

حضرت علامہ سمعانیؒ نے میرے تجسس کے پیشِ نظر بڑی مہربانی اور شفقت و عنایت

فرمائی اور فنِ کتابت سے تعلق رکھنے والے اربابِ علم وفضل کا تذکرہ اور ان کا پورا پسِ منظر، اس کے ابتدائی مراحل بھی بیان فرمائے، بڑی دلنوازی سے گویا ہوئے کہ ابن مرۃ، اسلم بن مندرہ اور عامر بن حدرہ عربی فن کتابت کے بانی ماہرین میں سے ہیں، تینوں کا تعلق قبیلہ طئی سے ہے بشر بن عبدالملک نے تینوں سے اکتسابِ فیض کر کے فنِ کتابت میں خوب مہارت حاصل کی اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم کی ترغیب دی اور بہتوں کو بطور فن کے باقاعدہ بہت کچھ سکھلا بھی دیا۔ آپ کے تلامذہ میں غیلان بن سلمہ ثقفی اور عمرو بن زیادۃ صاحبِ فن اور باکمال اصحاب میں شمار ہوئے۔ ثانی الذکر کو عمرو الکاتب کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔

سفیان بن امیہ، ابو قیس بن عبد مناف بھی کتابت میں مبشر کے لائق ترین تلامذہ میں سے ہیں، کوفہ میں ان کا خاندان بنو کاتب کے لقب سے معروف ہوا۔ مبشر بن عبدالملک اور ان کا بھائی اہلِ انبار کے مشہور عالم تھے مگر پیشہ کے لحاظ سے کاتب تھے اور اسی لقب سے مشہور ہوئے۔

اس کے بعد علامہ سمعانیؒ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبِ وحی جناب حضرت حنظلہ بن الربیع الکاتب کا تذکرہ کیا تو احقر کا ذہن فوراً جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بابرکت زمانہ اور دورِ مسعود کی طرف منتقل ہوا، ہجرتِ مدینہ کے بعد سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اولین ورق نگاہوں کے سامنے آگیا اور یقین ہو گیا کہ کتابت اور تصحیح کتب جو ہمارے اسلافِ امت اور اہلِ علم نے بطور پیشہ کے اختیار کیا تھا اس میں بھی یقیناً اشارۂ نبوت کو دخل تھا۔ آخر جو لوگ اپنی زندگی سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈھال چکے ہوں، جو زندگی کی تمام صلاحیتیں عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں کھپا چکے ہوں، وہ کب ایسا کام کر سکتے ہیں جس میں سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احیاء کا کوئی فائدہ حاصل نہ ہوتا ہو۔

یہ لکھائی پڑھائی اور کتابت نگاہِ نبوت کی منظورِ نظر تھی، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ آنے کے بعد سب سے پہلا جو کام کیا وہ مسجدِ نبوی کی تعمیر تھی۔ اسی عمارت کے ایک حصہ میں سائبان اور چبوترہ (صفہ) بنایا گیا تھا۔ یہی لکھنے پڑھنے کا اولین مدرسہ اور

کتابت وخطاطی اور تعلیمی ترقیوں کا مرکز تھا۔ یہی طلبہ کا دار الاقامہ تھا، طلبہ رات کو اس میں سوتے تھے اور اساتذہ مقرر کیے گئے تھے جو دن کو انہیں وہاں لکھنے پڑھنے اور مسائل دین وغیرہ کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

اللہ والوں کی مجالس کے کیا کیا اثرات اور برکات ہوتے ہیں، اہل دل تو نقد نتائج و ثمرات حاصل کرتے ہیں۔ یہ کور باطن اگرچہ اپنے نامۂ اعمال کی سیاہی کے پیش نظر اس کا حقدار اور اہل نہیں تاہم علمی اور روحانی خوشبو سے محروم نہ رہا۔ یہ حضرت سمعانیؒ کی مجلس روحانی ہی کی برکتیں ہیں کہ ذہن میں تاجدار ختم نبوت کی نگاہ میں اہمیت کتابت کا مضمون وارد ہو گیا ہے اور نگاہِ تصور میں حضرت عبد اللہ بن سعید بن العاصؓ کی شخصیت ابھر ابھر کر سامنے آ رہی ہے اگرچہ حضرت سمعانیؒ نے ان کا تذکرہ نہیں کیا۔ تاہم یہ تو تاریخ کی مسلّم حقیقت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن سعیدؓ عظیم خطاط، بہترین خوشنویس اور مشہور خوشخط تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی کاتب کی حیثیت سے مشہور تھے، جب قبولِ اسلام کی سعادت سے مشرف ہوئے اور خدام نبوت کی فہرست میں اپنا نام لکھوا دیا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ذمہ معلم الصبیانی کی ڈیوٹی لگا دی کہ مسجد نبوی کے صُفّہ میں رہنے والے طلبہ کو وہ خوشخطی و کتابت اور لکھنے پڑھنے کی تعلیم دیتے رہیں۔

اور یہ کوئی آسان کام بھی نہ تھا، مسجد نبوی کی درسگاہ اور امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اوّلین جامعہ میں قیام کرنے والے طلبہ کی تعداد دو تین یا دس، بارہ تک محدود نہ تھی بلکہ ستّر اور اسّی، اسّی طلبہ کا قیام ہوا کرتا تھا اور بعض اوقات ان کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہو جایا کرتی تھی ان کی کثرتِ تعداد کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ صرف قبیلۂ تمیم سے ۷۰، ۸۰ طلبہ آئے تھے۔ علامہ ابن عبد البرؒ لکھتے ہیں:۔

کان فی وفد تمیم سبعون او ثمانون رجلاً فاسلموا وبقیموا فی المدینۃ مدۃ یتعلمون القرآن والدین۔

(الاستیعاب)

قبیلۂ تمیم سے ۷۰ یا ۸۰ اشخاص اسلام لائے اور مدینہ منورہ میں ایک مدت تک ٹھہر کر قرآن سیکھا اور دینی تعلیم حاصل کی۔

اس لیے تنہا عبداللہ بن سعیدؓ کو تعلیم کتابت اور تعلیم مسائلِ دین کے لیے کافی نہ سمجھا گیا بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر صحابہ کرامؓ اور کاتبین اساتذہ کی بھی وہاں ڈیوٹی لگا دی تھی۔

حضرت عبادہ بن الصامتؓ کے متعلق بھی کتابوں میں منقول ہوتا چلا آیا ہے کہ انہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت اور لکھانے پڑھانے کی ذمہ داری سونپ دی تھی، وہ بھی اسی مدرسہ میں عبداللہ بن سعیدؓ کے معاون تھے، تعلیمِ کتابت کے علاوہ وہ بچوں کو قرآن بھی پڑھایا کرتے تھے۔

علامہ سمعانی "کتاب الانساب" میں جو علماء اور ائمہ و محدثین و مفسرین، فقہاء و مدرسین اور صحابہؓ و تابعینؒ میں کاتبین کی طویل فہرست نقل کر کے ستاتے رہے جن میں سے چند ایک کا اجمالی تذکرہ احقر نے ضبط بھی کر لیا ہے۔ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ علم اور اسلاف کی ایک بہت بڑی جماعت اس پیشہ سے وابستہ رہی۔ اس کی وجوہات متعدد ہو سکتی ہیں، مگر احقر کی رائے میں سب سے بہترین توجیہ یہی ہو سکتی ہے کہ یہ پیشہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو اختیار کرنے کی ترغیب دی تھی اور بعض حضرات کو تو اس پہ مامور بھی فرما دیا تھا۔ قرآن کی تعلیم میں بھی اس کو اہمیت دی گئی ہے۔ سورۂ نون میں تو خالقِ ارض وسما نے آلۂ کتابت قلم کی قسم تک کھائی ہے۔

اور سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ جب ہجرت کے دوسرے سال بدر کا معرکہ پیش آیا اور دشمن کی تعداد مسلمانوں سے تگنی تھی۔ اہلِ اسلام کے پاس صرف تین سو تیرہ سپاہی تھے جبکہ دشمن کی تعداد ساڑھے نو سو سے بھی زائد تھی پھر بھی مسلمان کامیاب رہے اور دشمن کے بہت سے سپاہی قیدی بن کر ان کے ہاتھ آئے۔ ان اسیروں کے ساتھ مسلمانوں نے جو برتاؤ کیا اور اس پر تاریخ کی جو تمت نہادتیں ہیں انہیں سُن کر عقل و فہم اور زندہ دل رکھنے والے سر دھننے لگتے ہیں، چنانچہ ہوا یہ کہ:۔

دشمن کی رہائی کا فدیہ یہ مقرر کیا گیا کہ جو قیدی فنِ کتابت سے آشنا ہو، لکھنا پڑھنا جانتا ہو وہ دس مسلمان بچوں کو اس فن کی تعلیم دے دے۔ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

کا فیصلہ تھا اور کتنا انقلابی فیصلہ تھا ــــــ بعض محدثین اور اکابر ائمہ حدیث نے اس واقعہ کا بھی خوب خوب عنوان باندھا کہ "مشرک کو استاد بنانے کا جواز" اگرچہ عنوان کے یہ الفاظ حدیث سے ثابت نہیں تاہم مفہوم کی صحت پر کسی کو اعتراض نہیں ــــــ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا بلکہ فنِ کتابت کی اہمیت اور تعلیم کی اشاعت کے بارے میں مستقل سیاست ہی کی گویا پیش رفت اور تکمیل تھی۔ صرف یہ نہیں بلکہ الکتانیؒ اور علامہ ابن عبد البرؒ وغیرہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے اقوال بھی نقل کر دیئے ہیں جن میں صراحتاً یہ منقول ہوا ہے کہ آپ بچوں کو حکم دیا کرتے تھے کہ اپنے پڑوسیوں سے علم سیکھیں اور اپنے اپنے پڑوس کی مساجد میں لکھنا پڑھنا سیکھا کریں۔

حضرت العلامہ سمعانیؒ کی مجلسِ روحانی میں اس بار کی حاضری میں جن عظیم رجالِ علم کی طویل ترین فہرست دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی، ان سب کا علمی رتبہ اور روحانی مقام بلند تر تھا وہ اپنے زمانہ کی آپ ہی مثال تھے مگر پیشہ اور کاروبار کے لحاظ سے سب ہی کاتب تھے۔ فنِ کتابت کو بطور پیشہ کے اختیار کرنے میں بھی استحکامِ دین، احیاءِ سُنت اور جذبۂ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کار فرما تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات و ہدایات میں کتابت اور تعلیم کو خصوصی اہمیت دی ہے۔

غالباً مورخ طبریؒ نے ۱۰ھ کے واقعات میں لکھا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو ناظرِ تعلیمات بنا کر یمن کی طرف بھیجا تھا۔ جہاں وہ باقاعدہ ایک ضلع سے دوسرے ضلع کا دورہ کرتے، لکھنے پڑھنے اور تعلیمات کی منصوبہ بندی کرتے، خواندگی کے بڑھانے اور جہالت کے مٹانے میں مساعی فرماتے اور اس سلسلہ میں جگہ جگہ قائم شدہ مدارس کی نگرانی کرتے اور نئے مدارس کے قیام و استحکام کے بارے میں تجاویز مرتب کرتے۔

کتابت اور تعلیمی مسائل کی اہمیت کے پیشِ نظر ازواجِ مطہراتؓ اور حضراتِ صحابیاتؓ بھی باقاعدہ اس کی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ بخاری شریف کتاب العلم میں صراحتاً یہ مذکور ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور ام المومنین حضرت حفصہؓ باقاعدہ لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔

اور غالباً مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ ام المومنین حضرت حفصہؓ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ سے اپنی ایک رشتہ دار خاتون شفا بنت عبداللہؓ سے لکھنا سیکھا تھا۔

بہر حال بات طویل ہوگئی، حضرت حنظلہؓ کاتب وحی کا تذکرہ ہوا، حضرت سمعانیؒ نے ان کا اسم گرامی یاد فرمایا تو احقر کے ذہن میں عہدِ نبوی میں کتابت، اس کی اہمیت اور ضرورت اور عملاً اس کی ترویج واشاعت کا مندرجہ بالا نقشہ متصور ہو گیا۔ یہ تو سنتے چلے آئے ہیں کہ اللہ والوں کی مجالس میں قلب جاری ہوتے ہیں اور لطائف میں انوار جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ اس کور باطن کو قلبی لطائف کے حقائق؟ یہ تمنا دری کب ہے! ہاں اتنی برکتِ روحانی مجلسِ سمعانیؒ کی مشاہدہ میں تو آہی گئی کہ حضرت حنظلہؓ کاتبِ وحی کے تذکرہ سے عہدِ نبوی کے فنِ کتابت کا اجمالی نقشہ قارئین کے سامنے مرتب کر کے رکھ دیا ہے ؎

مجھے زندگی کی خبر ملے، مجھے آگہی کی نظر ملے
مجھے رہگذارِ خیال میں کہیں وہ جو یار دگر ملے

بہر حال امام سمعانیؒ نے کاتبِ وحی حضرت حنظلہؓ کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ موصوف کتابتِ وحی کی وجہ سے کاتب کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ حضرت حنظلہؓ ان صحابہؓ میں سے ایک تھے جو کوفہ منتقل ہوئے مگر حضرت حنظلہؓ کوفہ میں بھی قیام نہ کر سکے اور قرقلیسا کو منتقل ہو کر وہاں مستقلاً قیام پذیر ہو گئے۔

اس کے بعد علامہ سمعانیؒ نے پیشہ کتابت سے تعلق رکھنے والے مختلف علماء اور اکابر اساتذہ حدیث اور ائمہ ومفسرین کا تذکرہ فرمایا۔

اولاً سلیمان الکاتب کا ذکر فرمایا، موصوف بلخ کے رہنے والے تھے۔ ابن الرماح کی کتابت کیا کرتے تھے، ابراہیم بن طہان اور مسلم بن خالد سے علمِ حدیث کی تکمیل کی اور جب فارغ التحصیل ہوئے تو اہلِ بلخ نے آپ سے کثرت سے استفادہ کیا۔

عبداللہ بن صالح الکاتب مصری بھی اپنے زمانہ کے مشہور محدث گذرے ہیں۔ ابن لہیعہ اور معاویہ ابن صالح سے حدیث پڑھی۔ ۱۳۷ھ میں پیدا ہوئے ۲۲۳ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

ابوالفیض یوسف کاتب بھی عظیم محدث اور ثقہ استاد تھے، شام کے رہنے والے تھے۔ امام اوزاعیؒ کی خدمت اور کتابت کیا کرتے تھے۔ بقیہ بن ولید، سعید بن یعقوب طالقانی اور امام اوزاعیؒ سے حدیث کی روایت کی۔ خطاب بن عثمانؒ آپ کے تلامذہ میں سرِفہرست ہے۔

ابو اسحٰق ابراہیم الکاتب، ابو مسلم محمد بن احمد الکاتب مشہور اساتذۂ حدیث میں سے ہیں مگر پیشہ کے لحاظ سے کاتب تھے۔ ثانی الذکر وزیر ابوالفضل کے شعبۂ کتابت سے وابستہ تھے ابوالقاسم عبداللہ بن محمد عبداللہ بن ابی داؤد سجستانی، یحیٰی بن محمد جیسے جبالِ علم سے حدیث کا علم پڑھا تھا۔ آپ کے تلامذہ کی فہرست میں ابوالحسن احمد بن محمد، محمد بن سلامہ جیسے باکمال اساتذۂ حدیث کے نام سرِفہرست ہیں۔

خوفِ طوالت کے پیشِ نظر حضرت سمعانیؒ کی بیان فرمودہ فنِ کتابت سے تعلق رکھنے والے عظیم اور اکابر رجالِ علم کی طویل فہرست میں سے چند ایک کے اسماء گرامی اور مختصر تعارف ضبط تحریر میں لاکر نذرِ قارئین کر دیا ہے۔

کاتب کا لفظ موجودہ ماڈرن دور کی اصطلاحات میں جتنا بھی بے وزن سمجھا جائے اور اس کی اہمیت پر جتنی بھی کم توجہ دی جائے مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کتابت رزقِ حلال کا صحیح ذریعہ اور اشاعت و حفاظتِ دین کا بہترین وسیلہ ہے، بچپن سے یہ شعر جو سنتا چلا آ رہا تھا کہ ؎

قلم گوید کہ من شاہِ جہانم
قلم کش را بدولت مے رسانم

علامہ سمعانیؒ کی مجلس میں اب کی آٹھویں بار کی حاضری کے موقعہ پر واقعاتی دنیا میں اس کے صحیح مصداق دیکھ لیے۔ آخر تدریسِ حدیث، خدمتِ دین، تعلیمِ قرآن اور تبلیغِ اسلام سے بڑھ کر رتبہ شاہ جہانی، مقام سعادت اور حصولِ دولت و اقبال کا کوئی دوسرا تصور بھی ہو سکتا ہے؟

اجمالی طور پر الانساب کی دی ہوئی کاتبوں کی طویل فہرست میں جن بزرگوں کا تذکرہ سنا اور تاریخ و رجال کے اوراق کو کھنگال کر ان کے سوانحی خاکوں تک رسائی حاصل کی تو

یہی معلوم ہؤا کہ کتابت و تصحیح کتب اور خطاطی ان کا مقصدِ حیات نہ تھا بلکہ ذریعۂ حیات اور بقا کا وسیلہ تھا۔ مقصدِ حیات تو ان کے نزدیک پیغامِ الٰہی کی معرفت، اس کی بجا آوری، اس کی تعلیم، اس کی دعوت و اشاعت اور اس کے حلقہ بگوشوں کی ایک پوری برادری قائم کرنا اور مکمل طور پر اس کے حقوق بجالانا تھا۔

وہ کتابت اور معلم الصبیانی میں بھی خیر کی دعوت، معروف کی اشاعت اور منکر کی ممانعت کرتے رہے، بسا اوقات دُنیا اپنی پوری وسعتوں، عیش پرستیوں اور دولت مندیوں کے ساتھ ان کے پاؤں پڑی مگر وہ اس کے چنگل میں آنے سے ہر بار بچتے رہے الغرض یہ انہی کے مجاہدات کا نور ہے جس کی وجہ سے کاشانۂ ملت روشن اور رونقِ اسلام سے معمور ہے۔

مجھے اس بات کا شدت سے افسوس اور احساس ہے اور اعتراف بھی کہ اب کی بار یعنی علامہ سمعانیؒ سے ملاقات کے اس آٹھویں مرحلے میں بھی افاداتِ علمی، انوار و برکاتِ روحانی اور مجالسِ سمعانیؒ کے ضبط و ترتیب اور اخذ و استفادہ کو کماحقہٗ قارئین کی خدمت میں پیش نہ کر سکا۔ تاہم بے ربط کی تحریر میں جو کچھ بھی بن سکا اس کے پیش کرنے میں بُخل اور کسل سے کام نہیں لیا، اور یہ باتیں ضبطِ تحریر کی ہیں کب؟ اس کے لیے تو دل چاہیئے دل سے

جو دل میں تھا اظہار میں آ ہی نہ سکا
الفاظ کے قالب میں سما ہی نہ سکا

ملاقات نمبر ۹

حلوائیوں کا کام کرنے والے اربابِ علم وفضل

امام حلوائی، امام بزدوی اور امام سرخسی

۲ رجمادی الاولی ۱۴۱۰ھ سے دار العلوم کے ششماہی امتحانات کا اعلان ہو چکا تھا۔ اسباق امتحان کی تاریخ سے ایک دو روز قبل بند کر دیئے گئے تھے، طلبہ امتحان کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ چونکہ اس سال سہ ماہی امتحان کی طرح ششماہی امتحانات میں بھی اول، دوم اور سوم آنے والے طلبہ کے لیے معقول انعام کا اعلان ہوا تھا۔ اس لیے اب کی بار طلبہ میں مسابقت اور مطالعہ و تکرار کا رجحان ہمیشہ کی نسبت سے زیادہ تھا۔ علم سے نسبت، اساتذہ علم کی صحبت کی برکتوں سے مجھے بھی دار العلوم میں طلبہ کی محنت و تکرار اور مطالعہ کے مناظر سے طبعی سرور و مسرت حاصل ہوتی تھی۔ یہ روح پرور مناظر دیکھ کر اپنے زمانۂ طالبعلمی، غفلت، کسل اور تضیع اوقات پر ندامت اور وقت کی قدر و قیمت و اہمیت کا احساس ہوتا رہا۔ اپنے اساتذہ، اکابر شیوخ و ائمہ، بزرگانِ دین اور محدثین کے زمانۂ طالبعلمی کے عبرت انگیز واقعات، تحصیلِ علم کا ذوق، شب بیداری اور مطالعہ کا شوق، اربابِ علم و فضل کی علمی زندگی کے مؤثر حالات گویا تاریخ کا ورق بن کر نگاہوں کے سامنے آ گئے۔

یہ تحصیلِ علم میں اخلاص اور زمانۂ طالبعلمی میں جذبۂ عمل ہی کی برکتیں تھیں کہ اللہ تعالٰی نے ان کی مقبولیت تامہ عوام اور خواص کے قلوب میں ڈال دی تھی۔ بعض کو قطبیت کبریٰ اور ولایتِ عظمیٰ کا مقام عطا فرمایا۔ بعض کی زبانِ فیض رساں سے حکمت اور علم و دانائی کے چشمے جاری فرمائے۔

بعض کو عالمِ ملکوت سے عالمِ دنیا تک کمال و جلال کا شہرہ عطا فرمایا۔

بعض کے ذریعہ علاماتِ قدرت و امارات، دلائل خصوصیت اور براہین و کرامت کا اظہار فرمایا، بعض کو عظمت و ہیبت، قطبیتِ وقت، روحِ معرفت، قلبِ حقیقت، وراثتِ کتاب، نیابتِ رسول اور سلطانِ طریق ہونے کے عظیم مراتب و مقامات پر پہنچایا۔ ایسوں کی شان اور رُتبہ و مقام، اللہ اللہ! کون ہے جسے ان کے جلوۂ جہاں آرائی پر تبصرہ و تعارف کی تاب ہو ے

آں مرد کاملے کہ بعرفان و عشقِ حق
در وقتِ خویش مثل خود اندر جہاں نداشت
آں حجتِ خدا کہ بہر جا قدم نہاد
باطل بصد خجالت و ذلت ازاں شتافت
مردانِ راہ گرد ازاں جا نیافتند
آنجا کہ اسپ فضل و کمالش دوید و تاخت

اس حسین تصور نے مجھے کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔ جیسے جیسے مناظر سامنے آتے رہے دل میں ان ہی کے عکسِ جمال کی کیفیات بھی اترتی گئیں۔ جس کی وجہ سے اب یہ یقین پختہ ہو گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دین کو ہر دور میں ایسے زندہ و جاوید، علم پرور اور علم گستر اشخاص عطا فرماتے کا ذمہ لے رکھا ہے، جو اسلامی و قرآنی اور علمی و روحانی تعلیمات کو زندگی میں منتقل کرتے رہیں گے، اور مجموعاً یا انفراداً اس دین کو تازہ اور اس امت کو سرگرم عمل رکھیں گے۔ اس لحاظ سے امتِ محمدیہ تاریخ عالم میں جیسی مردم خیز ثابت ہوئی ہے دنیا کی دیگر قوموں اور امتوں میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی —— اسی تصور نے اکابر اہلِ علم اور اربابِ فضل و کمال کی مختلف صورتیں دکھائیں۔

"الانساب" کے مصنف علامہ سمعانیؒ کی خدمت میں آٹھ مرتبہ کی حاضریوں سے جن عظیم شخصیات اور بزرگوں سے ملاقات و تعارف ہو چکا تھا، سب کا اجمالی تصور نگاہوں کے سامنے اُبھر اُبھر کر آ رہا تھا۔ اور ابھی پیاس بجھی نہیں بجھی تھی اور یہ کب بجھنے کی تھی ے

ہست دریائے محبت بے کنار لاجرم یک تشنگی شد صد ہزار

اللہ اللہ! ایسا افراد دماغی، علمی، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اپنے زمانے کے ممتاز ترین افراد تھے، کتنی طاقتور اور دلآویز شخصیتوں کے مالک تھے۔ یہی تو وہ ہستیاں ہیں جنہیں رسولؐ کے نائبین، امت کے مجددین و مصلحین کے القاب سے شہرت حاصل ہے یہی وہ مبارک شخصیتیں ہیں جنہوں نے اپنے یقین، سچی روحانیت اور قربانیوں سے دینِ اسلام کے پیروؤں میں نئی روح اور نئی زندگی پیدا کر دی تھی۔

ایسے حسین تصور اور مبارک خیال سے قلب مضبوط ہوا، ہمت کو بلندی ملی تو یہی امید لے کر اپنے محبوب مصنف "الانساب" کے عظیم مؤرخ حضرت العلامہ عبدالکریم سمعانی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلسِ روحانی میں پہنچ گیا۔ جدھر سے بھی کوئی علمی خیال آیا۔ اہلِ علم کی یادیں اور ارباب فضل کے کمالات متصور ہوئے تو عالم تصور کے ایسے مناظر میں علامہ سمعانیؒ ہمیشہ صدر نشین اور میر مجلس ہی نظر آئے ؎

بیاضِ دل میں فقط ایک نام چھوڑ گیا
وہ عمر بھر کے لیے کتنا کام چھوڑ گیا

اہلِ فضل اور اربابِ علم و کمال کی صحبتیں اپنی تاثیر و انقلاب میں بے حد مفید اور نافع اور ہر لحاظ سے نفع بخش ہوتی ہیں۔ مجھے تو جب بھی ایسے مواقع ملے بحمداللہ محروم نہیں لوٹا۔ اپنی نااہلی کا احساس تو ہے ہی مگر جن کی طلب صادق اور جذبۂ طلب مسلسل و مستقیم ہو، انہیں ایسی ہی مجالسِ فیض و برکت، درسگاہِ علم و فضل اور تربیت گاہِ روح و باطن ہی سے مستقبل کی فکر، جذبۂ دعوت و تبلیغ، شوقِ شہادت و عزیمت، رجوع و انابت الی اللہ، اتباعِ شریعت کی لازوال دولت و سعادت یقیناً حاصل ہوئی۔ خود ہمارے ممدوح حضرت سمعانیؒ کی مجالس کے ضبط و اشاعت پر کئی ایک قارئین کے خطوط موصول ہوئے جنہیں مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے اربابِ علم و فضل کے تذکروں کے مطالعہ و استفادہ سے علمی و روحانی طور پر حظِ وافر حاصل ہوا۔

چنانچہ مراد آباد (ہندوستان) سے حضرت مولانا علامہ افتخار فریدی صاحب اختر کے نام اپنے گرانقدر مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :-

"رسالہ دارالعلوم دیوبند میں "علامہ سمعانیؒ سے ملاقات"، آپ کا مضمون تین قسطوں میں دیکھ کر اس عریضہ کا داعیہ پیدا ہوا۔ ملتِ ہند و پاک کی تباہی و بربادی کا سبب پیشہ ور حضرات کی تذلیل سے ہوئی۔ جس طرح ہندو دیو مالیت نے عزت و ذلت کی بنیاد پیشے پر رکھی ہے! اس کا سب سے نمایاں طبقہ اچھوت اقوام ہیں۔ آج برصغیر کا مستقبل انہی پسماندہ اقوام کے ہاتھ میں ہے۔ جس طرح اسلام کے دورِ اول میں حق تعالیٰ شانہٗ نے غلاموں اور باندیوں کے ذریعہ دنیا کو دکھایا۔ خدا کرے "علامہ سمعانیؒ سے ملاقات" کا یہ تریاق جلد مکمل ہو کر جلد طبع ہو۔ ہماری ملت کے لیے اس وقت یہی حیات و بقا کا سبب بن سکتی ہے۔ ماشاءاللہ آپ کے قلب و دماغ کو حق تعالیٰ نے اس کام کی طرف راغب کر دیا ہے۔ جتنے پیشوں کے حضرات کے حالات اس میں ہیں حسبِ معمول پیشہ وار عنوان قائم فرما کر چار زبانوں میں شائع فرمائیں۔ عربی، اردو، انگریزی اور فارسی۔ حق تعالےٰ آپ سے یہ کام لے رہا ہے۔ خدا تکمیل کی توفیق بخشے۔ کم از کم اردو میں تو اسے جلد شائع ہونا چاہیئے۔ پھر انشاءاللہ ہندی، بنگلہ، تامل، تلگو، کنڑی، اور گورکھ مکھی وغیرہ زبان میں بھی اسے طبع کرا دیا جائے گا۔ آپ کا یہ تالیفی سلسلہ وقت کا امر ہے، چاہے آپ اس کے لیے استخارہ فرمالیں، کیا عجب کہ اس خطہ کی قیادت حق تعالےٰ شمال و جنوب کے قبائل کو عطا فرمائیں۔"

بہرحال حسبِ معمول موقع اور فرصت کو غنیمت سمجھتے ہوئے پھر سے حضرت سمعانیؒ سے کتابی ملاقات کی سعادت حاصل کر لی۔ اس دفعہ بھی موصوف نے کام و دہن کی حلاوت و عذوبت سے قطع نظر دل و دماغ کی ضیافت کو ترجیح دی۔

گفتگو کا موضوع یا افادات الیوم کا عنوان "حلوائی" قرار پایا۔ یہ عربی کا لفظ ہے مگر اردو، فارسی، پنجابی اور پشتو میں بھی سمجھا اور بولا جاتا ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ مٹھائی اور شیرینی بنانے اور بیچنے والوں کو حلوائی کہا جاتا ہے۔ ہمارے اسلاف میں بھی بہت سے [illegible] فضل و کمال نے

تحصیل واشاعتِ علم کے ساتھ ساتھ بقائے حیات اور قوت لایموت کی خاطر حلوائیوں کا کام کیا اور اس کو بطورِ پیشہ بھی اختیار کیا اور اسی پیشہ کی نسبت سے علمی حلقوں میں ان کا شہرہ "حلوائی" کے لقب سے ہوا۔

اسلام میں جن شیرینی اور مٹھائی بنانے اور بیچنے والوں نے دین و دیانت اور علوم و معارف کی مٹھائی و شیرینی سے اہلِ اسلام کے کام و دہن کی تواضع کی ہے اور روح کو لذت بخشی ہے ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ خود علامہ سمعانیؒ نے بھی آج کی مجلس میں ایک طویل فہرست بیان فرمائی۔ مگر خوفِ طوالت کے پیشِ نظر سب کے تذکرہ و تعارف کے بجائے چند ایک کے مختصر حالات، واقعات اور سوانح و افکار کا خلاصہ ضبط کر کے قدر دانِ علم و ادب کی خدمت میں بطور ایک علمی تحفہ کے پیشِ خدمت کیے دیتا ہوں۔

حلوائی علماء کی فہرست میں علامہ سمعانیؒ نے سب سے پہلے **ابو محمد عبد العزیز بن احمد حلوائیؒ** کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ موصوف شمس الائمہ کے لقب سے معروف تھے اور حلوائی کی نسبت ان کے لقب کا لازمہ بن گئی تھی۔

واہ! علامہ سمعانیؒ نے بچپن سے اپنی محبوب اور معروف شخصیت کا تذکرہ چھیڑ دیا کہ دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ درسِ نظامی میں فقہ حنفیہ کی مروجہ نصابی کتابوں میں شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جس نے شمس الائمہ حلوائی کا حوالہ نہ دیا ہو۔

اساتذہ نے پڑھاتے وقت جب بھی ان کا کوئی مقولہ، مسئلہ، حوالہ بارائے نقل فرمائی تو اس موقع و محل کی مناسبت سے شمس الائمہ کا پورا تعارف، پس منظر، لقب اور نسبت کی حقیقت بھی بیان فرما دی۔ یہ بچپن سے سنتا تھا اور اپنے اساتذہ سے بارہا سنا، اور "دفاع امام ابو حنیفہؒ" اور اب "علماء احناف کے حیرت انگیز واقعات" کی تالیف کے دوران جب حنفی رجال کے تذکرے پڑھے ان میں ایک شمس الائمہ حلوائیؒ بھی تھے جن کا عنوان اور نام ہی ایسا ہے کہ تراجم کی کسی بھی کتاب میں ان کا تذکرہ پڑھے بغیر آگے نہ گذر سکا۔

شمس الائمہ حلوائی اپنے زمانہ کے امام کبیر، فاضل بے نظیر، فقیہ و محدث، شیخ حنفیہ اور ثقہ مجتہد تھے۔ علامہ عبد الحی لکھنویؒ راوی ہیں کہ ابن کمال پاشا نے آپ کو مجتہدین فی المسائل

میں شمار کیا ہے۔

علامہ سمعانیؒ نے بتایا کہ موصوف نے قاضی حسین بن خضر نسفی سے علم فقہ کی تحصیل کی۔ علامہ عبدالحی لکھنویؒ نے اپنی معروف کتاب "الفوائد البھیہ فی تراجم الحنفیہ" میں یہ مزید تفصیل بیان فرمائی ہے کہ امام حلوائیؒ نے علم حدیث کی باقاعدہ تعلیم ابوشعیب صالح بن محمد، احمد بن محمد انماطی، ابواسحٰق رازی، اسمٰعیل بن محمد زاہد، عبداللہ کلاباذی، عبداللہ بن حسین، حافظ محمد غنجار جیسے اکابر ائمہ وقت اور ائمہ فن اور اپنے زمانہ کے مشہور اساتذۂ حدیث سے حاصل کی۔ امام طحاویؒ کی درسِ نظامی میں داخل اور باقاعدہ بڑی توجہ سے پڑھائی جانے والی معروف کتاب شرح معانی الآثار فاضلِ وقت محدثِ عظیم ابوبکر محمد بن حسین حمدان سے پڑھی۔ حنفی تراجم اور اسمائے رجال کی مختلف کتابوں میں موصوف کے جستہ جستہ مختصر واقعات اور آپ کے حق میں بعض ائمہ کے آراء واقوال، تصانیف کے ذریعہ موصوف کی فقہی خدمات، مخلصانہ زندگی، سیرت و اخلاق اور ظاہری و باطنی کمالات کے کچھ نمونے سامنے آجاتے ہیں اور سمجھنے والوں کے لیے بعض دیگر مخفی گوشوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اگر کوئی اہلِ قلم ادھر توجہ دے تو نوجوان طبقہ، علم کے حقیقی طالب علموں، سیرت اور فقہ و تاریخ کے موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس میں مطالعہ و تعمیرِ زندگی اور سیرت کی تشکیل میں وافر مدد ملے گی۔

علامہ سمعانیؒ کے تذکرہ اور ان کی مجلسِ روحانی کی برکت سے مجھے آج حنفی تراجم اور اسماء الرجال کی چھوٹی بڑی متعدد کتابوں سے استفادہ کا موقع بھی مل گیا۔ شمس الائمہ حلوائی کا تذکرہ میرے لیے کتابی مطالعہ و استفادہ کا ذریعہ بنا۔ آخر علماء کی مجالس اور علمی کتابوں کے تذکرے اور تعارف، مطالعہ کی انگیخت کا سامان نہ ہو تو اس کے سوا کسی دوسری چیز کی توقع بھی عبث ہے۔

الاکمال میں حافظ ابونصر بغدادیؒ نے امام حلوائیؒ کو "امام اہل الرائے" کے لقب سے ذکر کیا ہے۔ بہرحال اپنے زمانہ کے ہمعصر علماء، اقران اور طلباء اور شائقینِ علم میں آپ کی علمی زیرکی، فقہی دانائی، محدثانہ شان، تحقیق مسائل میں حزم واحتیاط ضرب المثل بن گیا، طلبہ کا اژدہام ہونے لگا۔ درس وافادہ کے حلقے قائم ہوئے۔ تلامذہ ومستفیدین، سائلین ومستفتیین

کا انبوہ ہوا کرتا تھا۔ آپ کا علمی تبحر، ذہانت، صاف گوئی، بحث و مناظرہ، صحیح استدلال، حاضرین و سامعین کو گرویدہ کر لیتا تھا۔

اسلام کے پورے علمی ذخیرہ پر کامل عبور، تفقہ و اجتہاد، استنباطِ احکام، استخراج جزئیات اور تدریس و تفہیم کی اللہ پاک نے حضرت امام حلوائی کو جس قدر صلاحیتوں سے نوازا تھا اس کا اندازہ آپ کے حلقۂ تلامذہ اور مستفیدین کی عظمت سے لگایا جا سکتا ہے۔

غالباً حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کا مقولہ ہے کہ استاد کی لیاقت، علمی منزلت اگر معلوم کرنی ہو تو تلامذہ اور شاگردوں کے حلقہ میں اُس کے متعلق جو تبصرہ اور رائے قائم کی جا چکی ہے، اس میں استاد کی شخصیت نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔

چنانچہ تراجم کی کتابوں میں آپ کے حلقۂ تلامذہ کی فہرست میں اعاظم رجالِ فقہ، بے نظیر مدرسین، مجتہدین، فقہاء، محدثین اور لاجواب کتابوں کے مصنفین دو زانو بیٹھے تحصیلِ علم میں مشغول نظر آتے ہیں۔

یہ سب کچھ موہبتِ خداوندی اور عطیۂ الٰہی تھا اور خداداد ذہانت و فراست، ریاضت و اخلاص، تعلق باللہ، علمی اشتغال و انہماک اور تقویٰ و طہارت اور جذبۂ خدمتِ دین جیسے اوصافِ حمیدہ ہی کا کرشمہ تھا کہ علامہ فقیر محمد جہلمی صاحبِ حدائق الحنفیہ اور علامہ سمعانی کے ارشاد کے مطابق شمس الائمہ بکر زرنجری، محمد بن علی، ابو بکر محمد بن حسین، فخر الاسلام علی بن محمد بزدوی، صدر الاسلام محمد بن محمد، قاضی جمال الدین، ابو نصر احمد بن احمد الرحمٰن جیسے اعاظم رجالِ علم، شہنشاہانِ علم و فقہ اور مراجع خاص و عام آپ ہی کی درس گاہ کے فیض یافتہ اور آپ ہی کی فیضِ صحبت سے بہرہ مند تھے۔

سب کا تعارف تو مشکل ہی ہے۔ البتہ فخر الاسلام علی بن محمد بزدوی ہی کے تعارف سے دیگر اکابر کی عظمت کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ گو علامہ سمعانی نے آج کی مجلس میں تفصیلی تذکرہ نہیں فرمایا، مگر اپنے اساتذہ سے زمانۂ طالبعلمی میں دورانِ درس امام بزدوی کا اسمِ گرامی بار بار سنا، جو اب گویا ایک مانوس اور محبوب نام بن گیا ہے۔

یہ وہی امام بزدوی ہیں جو اصول و فروع میں اپنے زمانہ کے امام ائمہ، شیخ حنفیہ، مرجعِ تام،

جامع علومِ مختلفہ، فقیہ کامل، جید عالم، عظیم محدث اور حفظ مذہب میں ضرب المثل ہیں۔ یہ القاب اور تعارف کے کلمات نہ تو علامہ سمعانیؒ نے بیان فرمائے اور نہ احقر نے اپنی طرف سے بڑھائے۔ بلکہ تراجم کی دسیوں کتابوں سے مختلف ائمہ علم کی رائے واقوال اور شہادتیں نقل کر کے انہیں ایک پیرایہ میں جمع کر دیا ہے۔ تراجم میں کثرت سے آپ کی تصنیفاتِ کثیرہ کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ یہ وہی امام بزدوی ہیں جنہوں نے گیارہ جلدوں میں مبسوط تصنیف کی۔ جامع کبیر اور جامع صغیر کی شروحات لکھیں۔ اصولِ فقہ میں آپ کی معتمد اور عظیم کتاب "اصول بزدوی" نے تو آپ کے نام کا شہرہ آفاق میں پھیلا دیا ہے۔ تراجم کی کتابوں نے آپ کی ایک ایسی تفسیر کی نشاندہی بھی کی ہے جسے آپ نے ۱۲۰ جلدوں میں تصنیف فرمایا ہے، جبکہ ہر جلد قرآنِ کریم کے حجم کے مساوی ہے۔

امام بزدویؒ کے بارے میں کتابوں میں ایک عجیب لطیفہ بھی منقول ہوتا چلا آیا ہے۔ حدائق الحنفیہ کے مصنف نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ بہر حال مشہور ہے کہ امام بزدویؒ کے زمانے میں ایک بڑا متبحر عالم شافعی المذہب آپ کے علاقہ میں آیا جس سے بھی وہ مناظرہ کرتا تھا اُس پر وہ غالب آجاتا تھا، حتّٰی کہ صورتِ حال یہاں تک پہنچی کہ بہت سے حنفیہ بھی مسلکِ شافعیہ کی طرف رجحان ظاہر کرنے لگے۔ علماء اور فضلاء جمع ہوئے اور ایک وفد کی صورت میں امام بزدویؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ:۔

"حضرت! آپ صورتِ حال پر نظر رکھیں اور اپنے علم و فضل کی وجہ سے ادھر توجہ دیں ورنہ ہم سب شافعی المذہب ہو جائیں گے۔"

امام بزدویؒ نے فرمایا: میں ایک فقیر اور گوشہ نشین انسان ہوں، مجھ کو مباحثہ اور مناظرہ سے کچھ کام نہیں، مگر وفد نے شدید اصرار کیا تو آپؒ نے ان کی التجا قبول کر لی، اور اسی مناظر عالم کی مجلس میں تشریف لے گئے۔ چنانچہ اس نے امام بزدویؒ کو دیکھ کر حضرت امام شافعیؒ کے مناقب کا بیان شروع کر دیا اور کہا کہ:۔

"امام شافعیؒ نے ایک مہینہ میں قرآن حفظ کیا، ہر روز ایک مرتبہ قرآن ختم کرتے تھے۔ رات کو تراویح میں سارا قرآن پڑھا کرتے تھے۔"

امام بزدوی نے فرمایا یہ تو آسان کام ہے، زمانۂ طالبعلمی اور اب علم سے وابستگی اور قلبی جذبہ اور شوق ہو تو قرآن کا حفظ کوئی اتنا مشکل نہیں، قرآن شریف یتمامہ علم ہے اور ہم اس کو اپنی یاد سے لکھا کرتے ہیں۔

جناب! سرکاری دفتر کا حساب کتاب لاؤ اور مجھے دو سال کا خرچ و آمد پڑھ کر سناؤ، چنانچہ لوگوں نے تعمیلِ ارشاد میں ایسا ہی کیا تو آپ نے سارے ریکارڈ پر ایک نظر ڈالی اور مکمل مطالعہ کر لیا، اور سرکاری کاغذات پر، اس غرض سے کہ کوئی ان میں تغیر و تبدل نہ کر سکے، سرکاری مُہر لگوادی اور ایک مکان مُقفل میں بند کرادیا اور خود حج پر تشریف لے گئے۔ جب چھ ماہ بعد لوٹے تو ایک بڑی تقریب قائم کی، مُقفل سرکاری کاغذات اور دفاتر منگوا کر لوگوں سے کہا اور خود اس شافعی المذہب عالم کے ہاتھ میں رجسٹر تھما دیا اور اسی مجلس میں تمام حاضرین کے سامنے چھ ماہ قبل سنا ہوا سینکڑوں صفحات پر مشتمل سارا حساب زبانی سُنا دیا یہاں تک کہ ایک حرف کی بھی غلطی نہیں لگی۔ جس سے شافعی المذہب مدعی کو شرم و خجالت اور شرمندگی و ندامت ہوئی اور اپنے کیے پر عمر بھر پچھتا تا رہا۔

علامہ سمعانی نے حلوائیوں کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے اربابِ علم و فضل کے تذکرہ میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ مشہور حنفی امام اور مصنف علامہ ابو سہل محمد بن احمد سرخسی بھی آپ کے شاگردِ خاص اور آپ ہی کی درسگاہ کے فیضیافتہ ہیں۔

بات طویل ہو جائے گی مگر ترک کر دینا بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ سچ پوچھئے تو اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں، وجہ اس کی بھی وہی ہے جو امام بزدوی کے ذکر میں عرض کر چکا ہوں کہ زمانۂ طالبعلمی میں اپنے اساتذہ نے جن حنفی ائمہ کا بار بار تذکرہ کر کے دل و دماغ میں ان کی شخصیتیں رچا بسا دیں۔ ان کے نام پر اور ان کے تذکار پر اگر دل نہ مچلے، طبیعت میں روانی نہ آئے تب تو ضرور تعجب کرنا چاہیئے۔ یہاں تو بحمد اللہ منفی پہلو ہے ہی نہیں، مثبت پہلو آپ کے سامنے ہے۔ یہ بھی میرا کوئی کمال نہیں۔ جن لوگوں کی جُوتیاں سیدھی کرنے کی برکتوں کے طفیل اللہ نے ائمہ احناف کا نام لینے کی توفیق بخشی ہے، یہ بھی ان ہی کا فیض اور ان ہی کی کرامتیں ہیں۔ بہر حال بات امام سرخسی کی چل نکلی، علامہ سمعانی نے گو ان کا تفصیلی تذکرہ اور حالات نہیں بتائے۔

شمس الائمہ حلوائی کے تلامذہ کی فہرست میں دوسرے اکابر ائمہ اور فقہاءِ عظام کے اسماء گرامی کی طرح آپ کا بھی نام مبارک تحریر فرمایا ہے، مگر تراجم اور اسماء الرجال کی کتابوں میں آپ کا تذکرہ تفصیلاً منقول ہوتا چلا آیا ہے۔ آپ بھی اپنے شیخ و مُربّی اور استاد کی طرح شمس الائمہ کے لقب سے مشہور تھے۔ اپنے زمانے کے امام، علامہ، مناظر، اصولی، فقیہ، محدث اور مجتہد تھے۔

ابن کمال پاشا نے آپ کو مجتہدین فی المسائل کے طبقہ میں شمار کیا ہے۔

ابتداء میں اپنے والد کی ہمراہی میں تجارت کی غرض سے بغداد تشریف لائے، اسی دوران استاذ الاساتذہ امام حلوائی سے ربط پیدا ہو گیا، پھر کیا تھا امام حلوائی کی نظر کیمیا اثر کام کر گئی، ایک بار دیکھا کہ گرویدہ ہو گئے۔ امام سرخسیؒ، امام حلوائیؒ کی مجلسِ فیض اثر سے اٹھنے کا نام بھی نہ لیتے تھے، تعلیم شروع کی، امام حلوائی کی صحبت، خدمت اور تحصیلِ علم میں مداومت اختیار کی، علوم ان سے پڑھے اور اُس وقت تک چھٹی و رخصت اور واپسی کا نام نہ لیا جب تک کہ علم و فضل میں تکمیل کے مراحل طے کر کے یگانہ روزگار نہ ہوئے۔

آپ کے زمانۂ حبس (قید) کی المناک داستان، جس میں عبرت و نصیحت کے کئی ابواب اور دسیوں پہلو موجود ہیں، اپنے اساتذہ سے بارہا سنتا رہا اور "دفاعِ امام ابوحنیفہؒ" کی تالیف کے دوران تراجم کی متعدد کتابوں میں اصل واقعہ خود مطالعہ کر کے ترجمہ و نقل کرنے کی توفیق ارزانی بھی ہوئی۔ قارئین کی دلچسپی اور افادہ کے پیشِ نظر جی چاہتا ہے کہ یہاں بھی اسے "دفاعِ امام ابوحنیفہؒ" سے نقل کر کے پیشِ خدمت کر دوں تاکہ دنیا پر واضح ہو سکے کہ ہمارے اسلاف اور ائمہ امت نے حلوائیوں کا کاروبار کر کے بھی انسانی سیرت کی تعمیر و تشکیل اور رجال کار کی تربیت اور آدم گری پر کتنی زیادہ توجہ دی تھی۔ خود امام حلوائی نے رجال کار کی جو عظیم کھیپ تیار کی ہے اُن میں تفصیلی تذکرہ سب کا تو نہ کر سکا البتہ امام بزدویؒ اور امام سرخسیؒ کے اجمالی تذکرے سے سب کی اہمیت اور وسعت اور مرتبہ و مقام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

چونکہ شمس الائمہ سرخسیؒ اپنے وقت کے امام، حق گو، نڈر اور بے باک عالمِ دین تھے، ہر وقت نصح و خیر خواہی کا جذبہ غالب رہتا تھا، اسی جذبۂ حق گوئی اور احقاقِ حق کی خاطر اپنے زمانے کے حکمران ترکی خان خاقان کو اعلاء کلمۃ اللہ کے پیشِ نظر کچھ نصیحت کی اور لوگوں پر ناجائز

محصول عائد کرنے اور بے جا مظالم سے روکا، مگر نشۂ اقتدار نے خاقان کو حق سُننے اور حق قبول کرنے کی بجائے غیض و غضب میں مبتلا کر دیا۔ خاقان نے امام سرخسیؒ کو حق گوئی کی پاداش میں سخت سزائیں دینا شروع کیں، آخر میں شہر جند کے جُب (کنوئیں) میں قید کر دیئے گئے پھر کیا ہوا؟ قدرت کی نیرنگی، ذوقِ علم اور اشاعتِ فقہ و احکام کا جذبہ دیکھئے:۔

امام حلوائیؒ کے اس ہونہار شاگرد کے تلامذہ آپ سے تحصیلِ علم کی خاطر کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ جایا کرتے تھے، شمس الائمہ امام سرخسیؒ اندر سے طلبہ پر املا کراتے تھے، استاد جو کچھ فرماتے طلبہ اسے اسی وقت قلمبند کر لیا کرتے۔ نہ کُتب خانہ تھا اور نہ کوئی کتاب ساتھ تھی، جو کچھ لکھواتے اپنے سابقہ مطالعہ، قوتِ یادداشت، فکرِ رسا، طبعِ ذکاء اور حافظہ کی مدد سے لکھواتے تھے۔ آپ کی وہی درسی و املائی تقاریر مرتب ہو کر آج ۳۰ جلدوں میں **مبسوط سرخسی** کے نام سے طبع ہو کر فقہ و قانون کے ماہرین اور ایک علمی دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال چکی ہیں۔

گویا فقہ اسلامی کی یہ عظیم انسائیکلو پیڈیا امام سرخسیؒ کے زمانہ حبس کے لیکچروں کا یادگار مجموعہ ہے جس میں جگہ جگہ امام سرخسیؒ نے اس کا ذکر کیا ہے کہ کتاب اس فصل تک پہنچی ہے اور میں ابھی تک اشرار کے ہاتھوں کنوئیں کی سزا کاٹ رہا ہوں۔

صرف یہ نہیں بلکہ تراجم کی کتابوں میں آپ کے مزید علمی شاہکار کنوئیں میں زمانہ حبس کی یادگار کتابیں ہیں، مثلاً کتاب عبادات کی شرح، کتاب الاقرار کی شرح اس قید ہی کے ایام میں آپ نے اپنے تلامذہ سے لکھوائیں۔

چنانچہ امام حلوائیؒ کے یہ ہونہار شاگرد امام سرخسیؒ جب شرح العبادات کے لکھوانے سے فارغ ہوئے تو اس کے آخر پر تصریحاً یہ تحریر فرمایا کہ:۔

ھٰذا اٰخر شرح العبادات باوضح المعانی واوجز العبارات املاء المحبوس فی محبس الاشرار۔	اب یہ شرح العبادات کا آخر ہے جو واضح اور مختصر مگر جامع عبارات میں ادا کیا گیا ہے اسے شریروں کے ایک شریف قیدی نے لکھوایا ہے۔

شرح سیرِ کبیر اور اصولِ فقہ میں آپ کی تصنیف بھی اسی زمانہ حبس کی یادگاریں ہیں۔

امام حلوائی کے اس ہونہار شاگرد کو قدرت نے بڑے کمالات سے نوازا تھا۔ اُستاد کی دعائیں اور صحبت و مجالس کی برکتیں علمی و عملی میدان میں اس کی زبردست پشت پناہی کر رہی تھیں۔

آپ کے تذکرہ میں مصنفین یہ واقعہ بھی لکھتے آئے ہیں کہ کسی نے آپ کے سامنے حضرت امام شافعیؒ کے فضائل و کمالات بیان کرتے ہوئے کہا کہ امام شافعیؒ کو کتابوں کی تین سو جلدیں یاد تھیں۔ آپ نے سُنا تو اپنے یاد کردہ کتابوں کے اجزاء کو شمار کیا جب گنتی مکمل کر لی تو ان کی تعداد بارہ ہزار نکلی۔

واہ! یہ تھی حضرت حلوائی کی نگاہِ کیمیا اثر کی تاثیر۔ دراصل وہ مجالس ہی ایسی تھیں کہ وہاں کی برکتوں سے گناہ دُھل جاتے تھے، نئے گناہوں کے ارتکاب کی ہمت ہی ختم ہو جایا کرتی تھی۔ گناہ کم ہو جائیں تو حضرت وکیع کی وصیت کے مطابق حافظہ قوی ہو جاتا ہے ؎

شکوت الی وکیع سوء حفظی
فاوصانی الی ترک المعاصی
فان العلم نور من اللہ
فنور اللہ لا یُعطی لعاصی

(ترجمہ) "میں نے امام وکیعؒ سے اپنے حافظہ کی خرابی اور کمزوری کی شکایت کی، تو انہوں نے بطور معالجہ مجھے گناہوں کے چھوڑ دینے کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ علم اللہ کے معارف کا ایک نور ہے جو گنہگار اور معاصی سے ناپاک قلوب میں نہیں رکھا جاتا۔"

مجھے افسوس ہے کہ امام حلوائیؒ کے تذکرہ میں تطویل ہو گئی۔ دیگر حلوائی ارباب علم و فضل کی فہرست جیسے علامہ سمعانیؒ نے مرتب فرمایا ہے میرے سامنے ہے۔ مگر کیا کہیئے مکتب حنفیہ اور ائمہ احناف کے سوانح و حالات ایسے کب ہیں کہ ان کے سامنے ہوتے ہوئے دوسروں کی طرف نگاہ اُٹھ سکے۔

بہرحال تطویل بھی لاحاصل نہیں۔ اگر امام حلوائیؒ کے تذکرہ میں یہ پہلو نہ دکھایا جاتا تو

شاید بات کمزور ہی رہتی۔ مقصد بھی یہی ہے کہ خود مجھے اور میرے پڑھنے والوں کو عمل کی انگیخت ہو۔ امام حلوائی کے ہونہار شاگرد امام سرخسیؒ کا تذکرہ اس لیے طویل ہوگیا کہ اُنکی زندگی میں کامیابی کی راہیں تلاش کی جاسکتی ہیں۔

لیجئے! ایک دو واقعات امام حلوائیؒ کے اس ہونہار شاگرد کے اور بھی عرض کر دیتا ہوں۔ خدا کرے کہ ہم سب کو اس سے اپنی زندگی سنوارنے کا فائدہ حاصل ہو۔ آپ کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ جب امام سرخسیؒ کو ترکی خان خاقان نے گرفتار کر کے شہر جند کے کنوئیں کی طرف بھیجدیا۔ پولیس والے آپ کو ہتھکڑیوں اور جولان میں جکڑ کر جند کی جانب لے جارہے تھے تو راستے میں جب بھی نماز کا وقت ہوتا بغیر کسی تحریک کے آپ کے بندھے ہوئے ہاتھ اور پاؤں خود بخود کھل جاتے، سرکاری جولان اور ہتھکڑیوں کے تالے چابی لگائے بغیر اس قیدی سے جُدا ہو جاتے۔ امام سرخسیؒ وضو یا تیمم کر کے اذان کہتے اور پھر تکبیر کہہ کر نماز پڑھنا شروع کر دیتے۔ چنانچہ پہرہ اور نگرانی کرنے والے سپاہی یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ سبز پوشوں کی ایک جماعت آپ کے پیچھے کھڑی نماز ادا کر رہی ہے۔

جب امام سرخسیؒ نماز پڑھنے سے فارغ ہو جاتے تو نگران سپاہیوں سے فرماتے کہ آیئے! اور مجھے باندھ لیجئے۔ سپاہی عرض کرتے حضرت خواجہ! ہم نے آپ کی کرامت اور عنداللہ رتبہ و مقام آنکھوں سے دیکھ لیا ہے، اب، ہم آپ کے ساتھ ایسا معاملہ کب کرسکتے ہیں۔

امام سرخسیؒ فرماتے کہ مَیں تو خدا تعالیٰ کے حکم کا مامور ہوں، اس کا حکم بجا لاتا ہوں تاکہ قیامت کے روز شرمندگی نہ ہو۔ اور تم سپاہی ہو، ظالم خاقان کے تابع اور تنخواہ خور ملازم ہو تمہیں بھی چاہیئے کہ اپنے آقا کا حکم بجالاؤ کہ اس کے ظلم سے خلاصی پاؤ۔

آپ کے تذکرہ میں "صاحب حدائق الحنفیہ" نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ جب آپ شہر جند میں پہنچے تو ایک مسجد میں نماز کے لیے داخل ہوئے، دیکھا کہ امام مسجد آستین کے اندر ہاتھ رکھ کر تکبیر تحریمہ کہہ رہا ہے۔ چنانچہ امام سرخسیؒ نے پیچھے سے آواز دی کہ تکبیر تحریمہ پھر کہنی چاہیئے۔ امام مسجد نے پھر حسب سابق آستین ہی میں ہاتھ رکھ کر تکبیر تحریمہ کہی، اسی طرح تین مرتبہ رد و بدل ہوا۔ چوتھی مرتبہ امام مسجد قرائن سے اندازہ لگا چکے تھے عرض کیا کہ

شاید آپ امام اجل سرخسیؒ ہیں ؟

فرمایا ہاں! وہی ہوں۔ امام مسجد نے تکبیر میں خلل اور اعادہ کے حکم کی وجہ پوچھی تو امام سرخسیؒ نے فرمایا :۔

محترم! مردوں کو ہاتھ آستین سے باہر نکال کر تکبیر کہنی چاہیئے۔ یہی سُنت ہے، مجھے ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنے میں عار محسوس ہوتی ہے جو عورتوں کے طریقہ کے مطابق ہاتھ آستین کے اندر رکھ کر نماز میں داخل ہو رہا ہو۔

ایک حیرت انگیز واقعہ ان کا جو بیان کیا گیا ہے جس میں جریانِ بطن کی وجہ سے چالیس مرتبہ عارضۂ شکم لاحق ہوا مگر ہر بار آپ نیا وضو بنا کر مطالعہ و تحصیل علم میں لگے رہے سبق قضا کرنا یا چھٹی تو کجا وضو کا ترک کرنا بھی گوارا نہ کیا۔ میرے تو اس واقعہ کے پڑھنے سے رونگٹے کھڑے ہو گئے تفصیلی قصہ یوں ہے :۔

—— شہر جند کے کنوئیں میں جب آپ قید کے ایام گذار رہے تھے تو اس کنوئیں کی منڈیر پر شائقینِ علم طلبۂ علومِ دینیہ حاضر ہوتے۔ آپ اندر سے پڑھاتے اور طلبا آپ کی تقاریرِ درس کو امالی کی صورت میں محفوظ کرتے رہے۔ کسی روز آپ نے ایک شاگرد کی آواز نہ سُنی، آپ نے حاضر طلبہ سے پوچھا کہ فلاں کی آواز نہیں آ رہی، موجود ہے یا چلا گیا ہے؟

ایک طالب علم نے عرض کیا حضرت! وضو بنانے گیا ہے چونکہ سردی زیادہ ہے اس لیے میں بسبب شدتِ سردی کے وضو نہ بنا سکا۔ امام سرخسیؒ نے اس طالبعلم کے یہ الفاظ سُن کر جلال آمیز لہجہ میں فرمایا :۔

عافاك الله، خدا تجھے معاف کرے، تجھے شرم نہیں آتی! اس قدر معمولی سی سردی میں تو وضو بنانے کی سعادت سے خود کو محروم کر رہا ہے۔ حالانکہ جب میری طالب علمی کا زمانہ تھا تو مجھے بخارا میں ایک مرتبہ جریانِ بطن کی شدید شکایت ہوئی، عارضۂ شکم لاحق ہوا، ایک ہی روز میں چالیس مرتبہ قضائے حاجت ہوئی، مگر میں نے نہ تو سبق کا ناغہ کیا اور نہ چھٹی کی درخواست دی۔ ناغہ و چھٹی تو کجا، چالیس مرتبہ قضائے حاجت کو جاتا رہا اور سخت سردی کے موسم میں ہر مرتبہ نیا وضو بنا کر اپنے تعلیمی مشغلہ میں بدستور مصروف رہا جب مکان پر آتا تو

میری دوات سردی کی شدت سے جم جایا کرتی تھی، میں اسی دوات کو اپنے سینے پر رکھ لیتا تھا جب سینہ کی گرمی سے وہ قدرے کام کی ہو جاتی تو اس سے اساتذہ کے امالی وتعلیقات کا کام شروع کر دیتا تھا۔

بہر حال اچھا ہوا کہ شمس الائمہ امام حلوائیؒ کے تذکرے سے علم وادب کی بہاروں کی کئی ایک جھلکیاں دیکھ لی ہیں۔

لکھا ہے کہ امام حلوائیؒ حلوہ بنانے کی وجہ سے حلوائی کہلاتے تھے۔ مگر اس کے علاوہ موصوف کی عادت مبارک یہ تھی کہ حلوہ بنا بنا کر اپنے اساتذہ، مشائخ اور طلبہ کو بڑی فیاضی سے کھلاتے تھے آج جو علماء کا طبقہ حلوہ خوری کی نسبت سے مطعون کیا جاتا ہے، ممکن ہے اس میں ایسے واقعات کا بھی دخل ہو، حالانکہ بازار میں اگر فی الواقعہ تحقیق کر لی جائے تو حلوہ خریدنے والے مولوی عام لوگوں کی نسبت دس فیصد سے بھی کم ملیں گے اور مشاہدہ بھی یہی ہے کہ حلوہ وہی لوگ زیادہ کھاتے ہیں جو اس نسبت سے مولوی کو زیادہ بدنام کرتے ہیں۔

علامہ سمعانیؒ نے بتایا کہ امام حلوائیؒ ۴۴۹ھ میں بمقام کش سے فوت ہوئے اور بخارا میں لے جا کر دفن کیے گئے۔

مجھے افسوس ہے کہ امام حلوائیؒ اور ان کے دو تلامذہ امام بزدویؒ اور امام سرخسیؒ کے تذکروں سے مضمون طویل ہو گیا ہے اور علامہ سمعانیؒ کے ارشاد فرمودہ دیگر حلوائی فضلاء اور صاحبانِ کمال کا تفصیلی تذکرہ مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

تاہم محمد حلوائیؒ کی شخصیت ایسی تھی کہ اُن کے شیخ وقت، اُستاذِ حدیث ہونے پر اپنے وقت کے علماء کا اتفاق تھا موصوف عالم باعمل اور حدیث و محدثین کا بے حد اکرام و تعظیم کرتے تھے، حدیث پر عامل تھے مگر فتویٰ علماء کوفہ یعنی احناف کے مسلک پر دیا کرتے تھے۔

تیسرے نمبر پر علامہ سمعانیؒ نے عبداللہ بن احمد حلوائیؒ کا تذکرہ فرمایا۔ موصوف بہت بڑے فقیہ، جید عالم اور حافظ الحدیث تھے، حلوائیوں کا کاروبار کر کے رزقِ حلال کماتے، کبھی کبھی پارچہ فروشی کا کاروبار بھی کر لیا کرتے تھے، اس لیے خود کو بزاز بھی لکھا کرتے تھے۔

عبدالرحیم بن عبداللہ حلوائیؒ علوم و معارف کا گنجینہ اور قرآنی و روحانی علوم کا گویا خزینہ

تھے۔ علامہ سمعانیؒ نے ان سے تلمذ اور تحصیل علم حدیث کو بڑے فخر و امتیاز کے ساتھ بیان فرمایا۔ کہتے تھے کہ عبدالرحیم حلوائی میرے شیوخ حدیث سے ہیں، بلخ اور مرو دونوں مقامات پر مجھے ان سے تحصیل علم حدیث کا شرف حاصل ہوتا رہا۔

بہرحال امام سمعانیؒ نے "الانساب" کے ص ۱۶۱ پر جن حلوائی اربابِ فضل و کمال کا تذکرہ فرمایا ان کے سوانح و افکار اور بے داغ کردار سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے دودھ اور شکر سے صرف حلوہ اور شیرینی ہی تیار نہیں کی بلکہ علم و عمل کی ایسی شیرینیاں بھی تیار کر کے تقسیم فرماتے رہے جن کی لذت سے مسلمانوں کے علمی و روحانی ذوق میں بڑی لطافت پیدا ہوئی ہے۔ ارتقاءِ علم و فکر اور تبلیغ و اشاعتِ دین کے جس قدر کرشمے آج دنیا میں نظر آتے ہیں یہ تمام ان ہی کی محنت و مشقت اور تدبر و تفکر کے نتائج ہیں۔ وہ فرشِ گل پہ چلنے کے بجائے خارزارِ جنگل پر چلتے رہے مگر علم کی آبرو پر آنچ نہ آنے دی۔ ان کا دائمی نصب العین علم کی اشاعت اور خدمتِ دین رہا۔ ان کی زندگی و مساعی کا یہی ایک منشور تھا جس میں وہ کسی بھی تبدیلی کے روادار نہ تھے۔

وہ صرف ایک ہی اصول "اتباعِ دینِ مبین اور اعتصام بحبل اللّٰہ المتین" کے پابند تھے۔ اسی میں انفرادی و اجتماعی، قومی و ملی فلاح کو مضمر سمجھتے تھے۔ ان کا اندازِ فکر مجتہدانہ تھا وہ احیاءِ اسلام کے داعی تھے، علم و ادب ان کا خاص موضوع تھا۔ ان کے لگائے ہوئے علمی گلستان اور روحانی گلشن قیامت تک شاداب رہیں گے۔ (انشاء اللہ)

ملاقات نمبر ۱

لوہاروں کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے

اربابِ فضل وکمال

ذی الحجہ ۱۴۰۶ھ کی تیسری تاریخ ہے، دارالعلوم حقانیہ میں عیدالاضحیٰ کی تعطیلات کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ صبح سے تدریس اور اس سلسلہ میں متون وشروح کے مطالعہ کا اب چند روز کے لیے فکر نہیں رہا۔ علمی تفکہ، اخلاقی اور روحانی بالیدگی کے لیے مشہور عالم، فقیہ و امام اور صاحب دل بزرگ قطبِ ربانی، عارفِ صمدانی علامہ عبدالوہاب شعرانیؒ کے افادات اور فیوض وبرکات سے استفادہ کے لیے " لطائف المنن والاخلاق فی وجوب التحدث بنعمۃ اللہ علی الاطلاق " کا مطالعہ شروع کیا۔ حسنِ اتفاق سے فیضِ علم کا سب سے پہلا جھونکا جس نے ہمیں بے حد متاثر کر دیا اور طبیعت میں نشاط و بہار، علم سے محبت و جذبۂ عمل، رزقِ حلال کی ضرورت و احساس کو اُبھارا! وہ علامہ شعرانیؒ کا یہ ارشاد تھا کہ:-

سید علی الخواصؒ فرمایا کرتے تھے کہ طلبۂ علوم دینیہ کے لیے اور علم دین سے تعلق رکھنے والے علماء اور طلباء کے لیے میں چاہتا ہوں کہ کوئی حرفت اور صنعت بھی ضرور سیکھیں جس سے اُن کو معاش حاصل ہوتا کہ وہ دنیا کے بدلے دین کو فروخت نہ کریں اور لوگوں کے خیرات وصدقات پر ان کی نظریں نہ للچائیں کیونکہ بلاضرورتِ شدیدہ ناجائز طور پر صدقات کھانے سے عقل کا نور مِٹ جاتا ہے جبکہ رزقِ حلال سے نورِ عقل میں اضافہ ہوتا ہے ـــــ اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ:-

طلبہ کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ اپنے نفس کو عمل سے فارغ رکھیں اور یہ سمجھیں کہ پہلے علم حاصل کرلیں فارغ ہو کر عمل کی طرف متوجہ ہوں گے، یہ شیطانی وسوسہ ہے جس کے ذریعے شیطان ان کو زوائد علوم میں جن کی حاجت دین میں شاذ و نادر واقع ہوتی ہے مشغول رکھتا ہے اور عمل کی توفیق نہیں ہوتی۔

سید علی الخواصؒ کے نصائح اور علماء و طلبۂ علوم دینیہ کے لیے صنعت و حرفت کی ضرورت اور باقاعدہ کسی فن کے سیکھنے اور اپنے ہاتھ سے رزقِ حلال کے کمانے کی مبنی بر حقیقت، پر خلوص نصیحت نے ہمیں پھر سے اپنے مہربان و محسن علامہ عبدالکریم سمعانیؒ کی یاد تازہ کرادی ہے۔

سوارہ بگذشتی و ما ہنوز از شوق

نہادہ روئے بخاکِ سُمِ سمندِ توایم

جہاں کے فیوض و برکات سے مسلسل ہمارے قارئین بھی بہرہ ور ہو رہے ہیں، خدا تعالےٰ عمل کی توفیق دے۔

اگر اہلِ علم طبقہ، اپنے اسلاف کے ارشادات کو حرزِ جان بنا کر عمل کی ڈگر پر روانہ ہوں تو جہالت کافور ہو جائے، رواجات اور بدعات کا دنیا سے نشان مٹ جائے۔ علماء کی اصلاح، علماء کا کردار اور اہلِ علم کے نیک اعمال، اتحادِ اُمت اور فلاحِ ملت کی ضمانت ہیں۔
غالباً حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

”میری امت کی دو جماعتیں ایسی ہیں کہ جب وہ درست ہوں گی تو سب آدمی درست ہوں گے اور جب وہ فاسد ہوں گی تو سب آدمی فاسد ہو جائیں گے۔ ایک جماعتِ ملوک و امراء دوسری جماعتِ علماء۔“

غالباً جامع العلم“ میں علامہ ابن عبدالبرؒ نے حضرت قتادہؓ کا ارشاد نقل فرمایا ہے کہ:۔

”علماء کی مثال ایسی ہے جیسے نمک، کہ جب کوئی چیز خراب ہونے لگے تو نمک اس کی اصلاح کر دیتا ہے لیکن اگر نمک خود ہی خراب ہو جائے مثلاً زیادہ ہو جائے تو اس کی اصلاح کسی چیز سے نہیں ہوتی۔“

علم و استفادہ اور مطالعہ اور کتاب کی بے حد رفاقت نے دل و دماغ کو باغ و بہار

بنا دیا۔ چشمِ تصور میں کئی ایک علمی حلقوں میں حاضری دی۔ نافع اور مخلص اکابر علماء امت کی تصوراتی زیارتیں ہوئیں۔ ملاقاتیں اور استفادہ، ازدیادِ ایمان اور یقین کی پختگی میں اضافہ ہوا۔ تاریخ کے اوراق اُلٹے حملۂ تاتار (۶۵۶ھ) کی قیامتِ صغریٰ کا منظر نگاہوں کے سامنے آگیا۔ ملتِ اسلامیہ پر کیسی قیامت گذری تھی اور اس سے کیا کیا نقصانات ہوئے؟ ایک ایک کر کے سامنے آتے گئے، طبیعت میں پژمردگی اور افسردگی کے آثار ثبت کرتے گئے۔ حملۂ تاتار سے مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ختم ہوگیا۔ ان کی تہذیب و تمدن کا جنازہ نکل گیا، ان کے علماء قتل ہو گئے، دارالکتب اور بڑی بڑی اسلامی لائبریریاں جلادی گئیں، ذہنی جمود مسلط اور رفتہ رفتہ اسلام کا تصور بھی تبدیل کر دیا گیا۔

ابھی اسی خیال میں محو تھا کہ یکایک ورق الٹ گیا اور تاریخ کا ایک روشن باب سامنے تھا۔ یہ حملۂ تاتار سے ماقبل کا زمانہ تھا۔ فارابی، رازی، ابن رشد، الکندی، سینا، البیرونی، المسعودی، ابن الہیثم، ابن البیطار جیسے ہزاروں اربابِ علم و فضل، علماء و حکماء تخلیق و تحقیق میں مصروف تھے۔ ابن رضوان اور الجزری گھڑیاں اور مشینیں بنا رہے تھے۔ الخازنی کششِ ارض پر غور کر رہے تھے شہاب الدین تفاشی لعل و زمرد کی اصلیت، چمک اور افادیت پہ لکھ رہے تھے۔ جابر بن حیان نے کیمیا پر ایک سو کتابیں لکھیں۔ ابن مسبحہ، اسحٰق موصلی، زلزل، ابن اسحٰق الوراق اور الکرمانی جیسے اربابِ علم و فن اپنے پسندیدہ فنون میں مگن اور ان کی تدوین میں مست تھے۔ ابو کامل، الکرجی، ابن فرجان، خوارزمی، ابو معشر بلخی، البتانی اور عمر خیام فن ریاضی کی توسیع اور تخلیق و تحقیق میں دنیائے انسانیت کی امامت کر رہے تھے، دیکھا کہ فقہاء ہیں، اطباء ہیں، مؤرخین ہیں، محدثین، متکلمین اور مفسرین ہیں، اور ان کی تعداد کا احصار مشکل ہے۔ کسی نے دو سو کتابیں لکھیں، کوئی چار سو کتابوں کا مصنف تھا۔ ان میں سے ایک ابن طولون دمشقی نے ساڑھے سات سو کتابیں لکھی تھیں۔ علمی و مطالعاتی اور روحانی و تصوراتی بہاروں کی اس دنیا میں طبیعت نشاط پر تھی، مزاج میں اشتیاق تھا، ذوقِ طلب میں ابھار تھا کہ اچانک علامہ عبدالکریم سمعانیؒ کی عظیم تاریخی لازوال شاہکار "الانساب" سامنے کھل گئی۔

حضرت سمعانیؒ کی محنت، مطالعہ، تحقیق، تجسس، وسعتِ نظر، دور اندیشی اور جدتِ فکر کے نقوش ایک ایک کر کے اُجاگر ہوتے گئے۔ کیسی کتاب لکھ گئے، کتنا حسین اور نقشِ جمیل چھوڑ گئے۔

کتاب کی ایک ایک سطر سے موصوف کی قوتِ عمل، عزم، ارادہ، خوش انتظامی، سلیقہ پسندی، خوش فکری، ذوقِ مطالعہ، شوقِ تحقیق، معیارِ تصنیف، غرض حُسن و جمال اور فضل و کمال کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جو کتاب کی ایک ایک سطر سے جھلک نہ پڑتا ہو۔

علامہ سمعانیؒ "الانساب" چھوڑ گئے کہ ایک کتب خانہ "الانساب" کو دیکھ دیکھ کر حیرت بڑھتی اور یہ یقین بنتا ہے کہ عملِ پیہم اور یقینِ محکم سے کس طرح اہم اور بڑے بڑے کام انجام دیئے جا سکتے ہیں بے سروسامانی میں کیسے کیسے ساز و سامان پیدا کیے جا سکتے ہیں، اور اب تو یقین پختہ ہو گیا ہے۔ والحمد للّٰہ علیٰ ذٰلک

اور اس میں زیادہ تر دخل علامہ سمعانیؒ کی "الانساب" ہی کا ہے کہ ناداری کے عالم میں بھی وہ کام انجام دیئے جا سکتے ہیں جو بڑی دولت کے ذریعہ سے بھی نہیں کیے جا سکتے۔

کتاب الانساب کا صفحہ ۱۷۵ سامنے کھلا ہوا ہے، سُرخی حدّاد ہے۔ عربی کا لفظ ہے، عربی میں لوہار کو حدّاد کہتے ہیں، خود علامہ سمعانیؒ بھی یہی لکھتے ہیں کہ:۔

هٰذا النسبة الى بيع الحديد و شرائه وعمله۔	حدّاد کی نسبت لوہے کی خرید و فروخت اور لوہے کا کام کرنے کی طرف ہے۔

اس لقب سے بھی اہلِ علم کی ایک بہت بڑی جماعت مشہور ہوئی کہ وہ خود یا ان کے اکابر اساتذہ یا آباؤ اجداد میں سے کوئی نہ کوئی لوہے کا کاروبار کیا کرتے تھے۔ چاقو، چھری، درانتی، تلوار بناتے یا خام مال کی تجارت کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ علم کے ہتھوڑوں سے جہالت اور ظلمت و رواج اور باطل قوتوں کا سر بھی کچلتے رہتے تھے۔

اِن لوہاروں نے علمِ دین حاصل کر کے علم کے فولاد کو اپنی قوتوں اور سخت جانیوں سے موم بنایا ہے۔ تاریخ گواہ ہے اور علامہ سمعانیؒ نے جو اہلِ علم لوہاروں کی طویل فہرست دی ہے اور ان کی سوانح و تذکرہ کے جو اجمالی اشارے دیئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بھٹیاں صرف لوہے کے گرمانے اور نرم کرنے کے کام نہیں آتی تھیں بلکہ ان میں کام کرنے والے دین و دیانت، علم و فضل، محنت و مطالعہ، تصنیف و تالیف، تبلیغ و تدریس، خطابت و جہاد، اصلاحِ معاشرہ اور اصلاحِ انقلاب اُمت کے نرم گرم حالات کو بھی درست کرتے تھے، انہوں نے

اپنی قوتِ ارادی کو بروئے کار لا کر علم و دین اور تعلیم و تدریس اور اشاعت و تبلیغ میں ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ لوگوں کے دلوں پر فرمانروائی شروع کر دی اور دنیا کے سامنے یہ نمونہ پیش کر دیا کہ تاج و تخت کے بغیر بھی اخلاص کی پاکیزگی، نیت کی طہارت اور عمل کی پختگی کے ساتھ فرمانروائی ہو سکتی ہے۔

امام سمعانیؒ نے حسبِ سابق اب کے بار بھی کتابی ملاقات میں لوہاروں کے طبقے سے تعلق رکھنے والے اربابِ فضل و کمال کی ایک طویل فہرست سنائی، سرِ فہرست امام ابوبکر محمد بن جعفر کنانی حدّاد شافعیؒ کا تذکرہ فرمایا۔ موصوف فقہ شافعیہ کے بہت بڑے جید عالم، امام اور فقیہ تھے، مصر کے قاضی تھے۔ فقہ شافعیہ کے فروعات تک پر انہیں ماہرانہ عبور حاصل تھا۔ ۳۴۴ھ میں انتقال ہوا۔ موصوف حدّاد تھے، خدمتِ علم کے ساتھ ساتھ کسبِ معاش کے لیے لوہاروں کا پیشہ اختیار کیا ہوا تھا غیر کے احتیاج پر اپنے ہاتھوں کی کمائی کو ترجیح دیتے تھے۔ موصوف نے اپنی روزمرہ کی زندگی میں اور عام معمول اور معاشرتی بود و باش میں فقیری میں امیری، بے سروسامانی میں سامانی اور تنگدستی میں کشادہ دستی کی لازوال مثالیں قائم فرمائیں۔ ان کا کاروبار لوہاروں کا تھا، سادگی و تواضع اور غربت و افلاس دونوں ان کے رفیق تھے مگر اس سادگی میں بھی ان کی عزیمت کی پرکاری نظر آتی تھی وہ اپنے اساتذہ اور اسلاف کی طرح اپنی وضعداری کے لیے ہر جگہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے علمی و مطالعاتی اور فقہی کمالات اور مآثر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی علمی مباحث اور استنباط و استخراجِ مسائل میں اپنے معاصروں اور دوستوں سے اختلاف کیا کرتے تھے مگر اس میں بھی ان کی مروّت و شرافت اور حُسنِ اخلاق کے موتی جھلملاتے رہتے۔

تلامذہ کو تنبیہ و انذار کرتے، بعض اوقات ڈانٹتے بھی تو اُن کی ڈانٹ میں اخلاص ہوتا اصلاح کے غصہ و پھٹکار میں بھی کریم النفسی چھپی رہتی۔ حدّادی کا کام کر کے رزقِ حلال کماتے تو اپنے ہاتھ کی کمائی سے خوش ذائقہ کھانا پکواتے اور جسے بہت خوش سلیقگی کے ساتھ خود بھی کھاتے اور طلبہ کو بھی کھلاتے، تدریس ہوتی یا تقریر یا عام نجی مجالس، وہ اپنی بذلہ سنجیوں کے پھولوں کو سامعین پر بے تکلفی سے نچھاور کرتے رہتے جس میں دامنِ علم دامان کے شمامہ کی نکہت

بیزی محسوس کرتے۔

اس کے بعد امام سمعانیؒ نے حسن یعقوب بن یوسف صوفی حدّاد کا تذکرہ فرمایا موصوف نیشاپور کے رہنے والے تھے۔ صوفی، زاہد، متقی، پرہیزگار اور علم دوست انسان تھے سلوک و طریقت کے طلبہ کی اصلاح و تربیت کے لیے مستقل خانقاہ قائم فرمائی تھی۔ طالبانِ سلوک اور مخلصینِ طریقت کے ہر وقت ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے رہتے تھے اور ان کے وسیع دسترخوان پر ہمیشہ زاہدوں اور صوفیوں کا مجمع لگا رہتا تھا۔

خدمتِ دین اور اصلاح و تربیت میں ہمہ وقتی مشغولیت کے باوجود سرمایہ داروں، نوابوں، جاگیرداروں اور دنیاداروں کی طرف کبھی بھی للچائی نظر سے نہیں دیکھا۔ استغنا اور بے نیازی ان کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ اور متاعِ عزیز تھی۔ حدّادی کا کام کیا اور اس میں ایسے نئے نئے طریقے اور وسعتیں پیدا کیں کہ طالبانِ طریقت اور عاشقانِ علومِ نبوت کے لیے ان کا دسترخوان ہمیشہ کھلا اور معمور رہتا تھا۔ تدین اور علم و تقویٰ کی ایسی مثالیں تاریخ میں کم ملتی ہیں۔ رجب ۳۳۶ھ میں وفات پائی۔

ابھی حسن حدّاد کا تذکرہ جاری تھا اور ان کے کارہائے نمایاں اور کرامات و مقامات کی بات ہو رہی تھی کہ نظر ابو حفص حدّاد پر پڑ گئی۔ علامہ سمعانیؒ نے ان کا بھی بڑی فراخدلی، کشادہ روئی سے تعارف کرایا۔ ابو حفص عمر حدّاد بھی نیشاپور کے رہنے والے تھے، وہاں کے اکابر اور مشاہیر صوفیاء کرام سے ہیں۔ علم و تقویٰ میں مرجع خاص و عام تھے، طلبہ کا ہجوم رہتا تھا طالبانِ طریقت اپنے باطن کی صفائی یہاں سے پاتے تھے۔ خراسان کے بعد والے چند اکابر اور جبالِ علم میں ان کا نام سرِفہرست تاریخ نے محفوظ کر لیا ہے۔ ان کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ ۲۶۴ھ یا ۲۷۰ھ میں وفات پائی اور تدفین نیشاپور میں ہوئی۔

حدّادوں کا تذکرہ تھا۔ علماء اور فضلاء جو حدّادی کی نسبت سے مشہور تھے، علامہ سمعانیؒ ایک ایک کر کے متعارف کرا رہے تھے نہ اُن کو سیری ہوتی تھی اور نہ ہم طلبہ کی تشنگی بجھتی تھی ؎

عشق آمد و شُد ساری چوں بو بگلاب اندر

اُو در من و من در وے سرّیست ز اسرارم

چوتھے نمبر پر علامہ ابوالمقدام ثابت حداد کا تذکرہ چھڑ گیا۔ حضرت سمعانیؒ نے بتایا کہ موصوف جید عالم فاضل اور تبع تابعین سے تھے۔ ان کے اساتذہ میں سعید بن مسیبؒ، زید بن وہبؒ اور سعید بن جبیرؒ جیسے جبالِ علم کا نام آتا ہے۔ ابوالمقدامؒ نے بڑے ادب و احترام، پوری طلب، تڑپ، اخلاص اور دلنوازی کے ساتھ تحصیلِ علم کی تکمیل کی۔ جن علماءِ تابعین سے حدیث پڑھی زندگی بھر ان کے اکرام و احترام کو ہر چیز پر ترجیح دی۔ اُن کی ذات و شخصیت تو اپنی جگہ، جب اساتذہ کا ذکر کرتے یا اُن کا نام آتا تو ایسا معلوم ہوتا گویا ابوالمقدامؒ ان کے نام کی عظمتوں پر نچھاور ہو رہے ہیں۔

اسی ادب و احترام اور کمال محبت و اطاعت کی برکتیں تھیں کہ ابوالمقدام کی درسگاہِ علم و فیض کو چہار دانگ عالم میں شہرت حاصل ہوئی، آپ کو مرجع الخلائق بننا پڑا، آپ سے خدا نے علمِ حدیث کی تدریس و اشاعت کا کام لیا۔ عمرو بن ثابتؒ آپ کے بیٹے ہیں آپ کے شاگرد بھی اور آپ کے جانشین بھی۔ حضرت حکمؒ اور حضرت سفیان ثوریؒ جیسے اکابر اور اربابِ علم و فضل نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے پر فخر محسوس کیا اور آپ کی درسگاہ سے فیضِ علم حاصل کرتے رہے۔

ابوبکر احمد سندی حدادؒ کا نام آیا تو علامہ سمعانیؒ کا قلم جھومنے لگا۔ ہمیں بھی مسرت تھی اور خوشیوں کی انتہا نہ رہی جب یہ معلوم ہوا کہ ابوبکر احمد حدادؒ ہمارے پاکستان کے علاقہ سندھ کے رہنے والے تھے۔ تحصیل و تکمیلِ علم سے فارغ ہوئے تو بغداد میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ بہت بڑے محدث، صاحبِ طریقت اور باخدا بزرگ تھے۔ ظاہر و باطن میں یک رنگی تھی۔ فریابیؒ اور محمد بن عباس مجذوبؒ سے علمِ حدیث کی تکمیل کی۔ پھر بعد میں اپنی ساری زندگی خدمتِ حدیث کے لیے وقف کر دی۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کو بھی آپ سے نسبتِ علم پر فخر تھا۔

بہر حال مجھے تو ایک ایک نام کے ساتھ وجد آتا رہا، حیرت و استعجاب کی انتہا نہ رہی کہ ہمارے اسلاف نے حفاظتِ علمِ دین میں کس قدر تعب، محنت و مشقت برداشت کی، شبانہ روز مزدوری اور حدادی سے رزقِ حلال بقدرِ قوتِ لایموت کمایا، پھر اسے خود بھی کھایا

اور دوسروں، کو بھی کشادہ جبینی سے کھلایا۔

دراصل اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ طالبعلمی ہیں ابتدائے روز سے مُخلص تھے، انہوں نے حصولِ سند، تحصیلِ منصب یا قضاء و افتاد کے لیے یا بڑا بننے اور لوگوں کو اپنی بڑائی منوانے کے لیے طالبعلمی کی راہ نہیں اختیار کی تھی بلکہ وہ روزِ ازل سے اپنے خالق کی رضا چاہتے تھے اور دمِ واپسیں تک اس مقصد کے حصول میں مگن رہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ بغیر علمِ دین و تعلیمِ شارع کے اخلاص کے ساتھ تحصیل کے ایسے راستے کا معلوم کر لینا کہ جس سے اپنے خالق کی رضا حاصل کی جائے یا وطنِ اصلی اور مقصدِ تخلیقِ آدم تک پہنچا جائے ناممکن ہے، بغیر علم کے اِنسان مُردہ ہے اور بغیر عمل کے علم اتمامِ حُجت ہے ولنعم ما قیل ؎

وفی الجھل قبل الموت موت لاھلہ ‏ فاجسامھم قبل القبور قبور

وان امرءلم یحیی بالعلم میت ‏ ولیس لہٗ حتی النشور نشور

(ترجمہ) جہالت میں موت سے پہلے بھی موت ہے اور جہلاء کے اجسام قبروں سے قبل قبریں ہیں ــــــ اگر کوئی انسان علم سے زندہ نہ ہو تو وہ مُردہ ہے اور قیامت کے اٹھنے تک اس کے لیئے کوئی زندگی نہیں۔

ملاقات نمبر ۱۱

مزدوروں کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے

اربابِ فضل و کمال

علامہ عبدالکریم سمعانیؒ سے ہماری گذشتہ دس کتابی ملاقاتیں نہایت مفید رہیں اور کسی کو فائدہ پہنچا ہو یا نہیں، خود مجھے ذاتی طور پر اس کا بے حد نفع ہوا۔ اسلاف کی عظمت، اکابر کی محبت، اسلام کی صداقت، کسبِ معاش میں رزقِ حلال اپنے ہاتھ پاؤں کی کمائی، امیروں اور سرمایہ داروں سے بے نیازی، اعتماد علی اللہ، احقاقِ حق، اعلاءِ کلمۃ اللہ اور خدمتِ دین عملاً نہ سہی، علماً اور شعوری طور پر ان کی واقعیت اور اس کے نتیجے میں ٹھوس ثمرات کے ترتب کا یقین بن گیا ہے۔ والحمد للہ علیٰ ذٰلک

کل کی مجلسِ سمعانیؒ میں حاضری آج کے استفادے کا پیش خیمہ بنی۔ محبوب کا جمال فطری ہو، اس کی ادائیں تصنع سے پاک ہوں، اس کے مزاج میں وفا کا خمیر ہو، اس کی طبیعت میں حُسنِ لطافت اور شفقت و محبت ہو تو محبین بھی صادقین ملتے ہیں اور آنے والے دامِ محبت میں ایسے گرفتار ہوتے ہیں کہ زلفِ محبت سے مخلص اور واپس جانے کا نام بھی نہیں لیتے۔ میرے ایک محسن اخترِ محترم نے غالباً ایسے ہی موقع کے لیے کہا تھا ؎

بے ارادہ جب اُٹھی میری نگاہ تیری طرف ۔۔۔ تیرے دامِ زلف میں اٹکی، اٹک کر رہ گئی

کیا کہوں میں لاکھ روکوں تب بھی یہ رُکتی نہیں ۔۔۔ میری جسم و جان بہت دن سے ہی تیری رہ گئی

ھمیں بھی علامہ سمعانیؒ کی بے پناہ علمی شفقتوں، مطالعاتی ضیافتوں اور رُوحانی توجہ و عنایت

نے کچھ ایسا مائل بہ سماعت کر دیا ہے کہ اپنے اس خاص موضوع میں علامہ سمعانیؒ کے ارشاداتِ عرفانی کے مطالعہ و سماعت کے بغیر کسی دوسری جانب نہ تو نظر اٹھتی ہے اور نہ کان کسی دوسری آواز پر سماعت کے لیے تیار ہوتے ہیں ع

تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

یہی طبیعت کی مجبوری تھی اور کچھ ذوق کی کارستانی اور کچھ شوقِ مطالعہ کی جولانی کہ آج پھر سے علامہ سمعانیؒ کی "الانساب" پر دستک دی، تاریخ کے ابواب کھل کھل کر سامنے آتے گئے، کئی دور دیکھے، کئی حکومتیں دیکھیں، چشمِ تصور میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان ورق ورق بن کر سامنے آتی گئی۔ عروج کے پس منظر اور ادبار کی وجوہات پر غور و فکر کی صلاحیتیں صرف ہوئیں۔ ۱۲۰۶ صفحات کی "الانساب" تاریخ کا انسائیکلوپیڈیا اور اپنے موضوع کی دائرۃ المعارف ہے۔ آج ورق الٹتا رہا، کسی ایک جگہ پر نظر کب جمتی تھی، ایک سے ایک بہتر تھا، انتخاب مشکل تھا، کچھ طبیعت کی بھی مجبوری تھی اور کچھ تقدیر کی موافقت بھی یہی تھی کہ آج ساری کتاب پر اُچٹتی نظر پڑ جائے شاید فائدہ زیادہ ہو۔ جی ہاں! آج ایک فائدہ حاصل ہوا اور بہت بڑا فائدہ ـــــ آج علماء کی عظمت، اہلِ علم کی ضرورت و اہمیت کائنات کی ایک واضح اور روشن واقعاتی حقیقت بن کر سامنے نکھر نکھر کر آتی رہی اور شاید قارئین بھی اس میں میرے ساتھ شریک ہو جائیں۔

سب جانتے ہیں اور کسی کو بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ہر قوم کی تعمیرِ حیات اخلاقی اور روحانی اساس پر اٹھائی جاتی ہے۔ یہ اساس متزلزل ہو جائے تو آلاتِ حرب کی فراوانی اور اور افواج کی کثرت اسے زوال سے نہیں بچا سکتی۔ علم و عمل، تعلق مع اللہ، اخلاص و عبودیت، اعتماد علی اللہ، رزقِ حلال اور اس سے پیدا ہونے والا خون ایک ایسی مہیب قوت ہے جو وقت پڑنے پر طوفانوں، بجلیوں اور آسمانی لشکروں کو بھی امداد کے لیے بلا سکتی ہے۔ یہ قوت صرف پاکیزہ اخلاق، آسمانی علم، قرآنی نظام، دینی خدمت، انسانی ہمدردی، کسبِ معاش میں رزقِ حلال اور مخلصانہ بندگی و عبادت سے حاصل ہوتی ہے۔ مسلم فرمانرواؤں نے اپنی اپنی قلمرو میں نظامِ علم و عمل اور نظامِ اسلام کے ترک کر دینے سے اس پُراسرار اور اعجاز آفرین قوت کے ذخائر گم کر دیئے، سلاطین، علم و تقویٰ کے عظیم فلسفے سے غافل ہو گئے اور اس نظام کے

قیام واستحکام کی افادیت کے بڑی حد تک منکر ہو گئے۔ حالانکہ اسلام ایک ایسا ہمہ گیر نظام ہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہے۔ کسی فرد کی اصلاح مقصود ہو یا عائلی زندگی میں سکون، جماعت کا نظام سیاست ہو یا شعبہ معاشیات، بین الاقوامی روابط ہوں یا بین الملی تعلقات، اسلام کے پاس ایسی روشن ہدایات موجود ہیں جو امن عالم کی کفیل اور معاشرتی توازن کی ضامن ہیں۔ بالفاظ دیگر اسلام اُن تمام اصول وضوابط کا مجموعہ ہے جو انفرادی اور ملی زندگی کی تنظیم کرتے ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین پورے اسلام کا مظہر تھے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد آپ کے ورثا حضرات علماء ہیں جن کی مساعی ومحنت، جن کی تعب وجد وجہد، جن کی شب بیداری اور مشقت، تحصیل و حفاظت علم، کسب معاش اور رزق حلال اور فکری کاوشوں اور اعمالِ صالح سے مسلمانوں کی انفرادی زندگی جو حیاتِ ملی کی آئینہ دار بھی ہے محفوظ چلی آ رہی ہے اور اجتماعی زندگی بھی، کہ یہی علماء اور نبیؐ کے ورثا، باپ، بیٹا، بھائی، ہمسایہ اور شہری ہونے کے علاوہ صدرِ ریاست، کماندار، قاضی، مفتی، جج، معلم، ہادی اور مرشد بھی تھے۔ وہ افراد تھے لیکن ملت میں گم، قطرہ دریا میں مل جائے تو اس کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔

علم اور عمل صالح، تقویٰ اور للہیت اور خلوص سے خدمتِ اسلام وہ واحد نظام ہے جو انسان کو پستیوں سے اٹھا کر گردوں نشین بناتا اور اسے رفعت وعظمت اور جمال وکمال عطا کرتا ہے ؂

یہ مال ودولت دُنیا یہ رشتہ وپیوند
بتانِ وہم وگمان، لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

اہلِ اسلام کو اپنے علماء، فقہاء، مجتہدین، مفسرین، اساتذۂ علم، طلباء دین کا شکر گذار ہونا چاہیئے جنہوں نے ہر حال میں قوم کی بے مہری، ناقدری بلکہ استہزاء اور تضحیک کے باوجود اسلام کے نظام علم وتدریس، اسلام کے نظام عمل وتبلیغ اور اسلام کے نظام بندگی وعبادت کو قائم رکھا۔ محنت کی، مزدوری کی، بوریاں اٹھائیں، قلیوں کا کام کیا، سڑکوں پر گدالیں چلائیں، اینٹیں اٹھائیں، گارا کیا، مگر خدمتِ علم واشاعتِ دین کے

کام کو کسی معاوضہ کے بغیر محض فی سبیل اللہ ادا کیا۔ اور الحمد للہ کہ یہ سلسلہ تاہنوز جاری ہے۔ یہ علماء ہی ہیں جنہوں نے اسلامی اقدار کو زندہ رکھا ہوا ہے اور قوم کے سامنے سادگی، قناعت اور خدمتِ خلق کا اعلیٰ نمونہ پیش کر رہے ہیں۔ اقبال مرحوم نے علماء ہی کے لیے کہا تھا ؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان — گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریل امین بندۂ فانی — ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشاں
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے — دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

بات لمبی ہو گئی، آخر جذبات ہیں، حضرت سمعانیؒ کی "الانساب" اتنا بھی اثر نہ کرے تو کیا کرے مطالعاتی ملاقات میں آج علامہ سمعانیؒ نے "الانساب" کا صفحہ ۱۱۰ کھول دیا، شہ سرخی یا گفتگو کا عنوان حمال تھا۔ حمال عربی میں ان لوگوں کو کہتے ہیں جو دوسروں کا سامان اور بوجھ لے آتے اور لے جاتے ہیں اور لوگوں کا مال و اسباب ایک جگہ سے دوسری جگہ پر اجرت اور مزدوری پر پہنچاتے ہیں۔ علامہ سمعانیؒ نے آج پھر حسب سابق ایک طویل فہرست ایسے علماء، فضلاء، مشائخ، ائمہ وقت محدثین و مفسرین کی سنائی جنہوں نے علم دین کی بار برداری اخلاص و للہیت کی مزدوری پر کی ہے اور علومِ نبوت کا بار اپنے سروں پر اٹھا کر دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچایا ہے۔

آج کے تذکرہ میں سرِ فہرست **مشکان حمال** تابعی کا ذکرِ خیر چھڑا تو ارشاد فرمایا مشکان حمال ہیں بار برداری کا کام کرتے تھے، مزدور تھے، قلی تھے، ان کی پیٹھ لوگوں کا مال اٹھانے اور پیٹ بھرنے کا کام کرتی مگر ان کا دل علومِ نبوت کا مخزن تھا، فقر و فاقہ، غربت و افلاس تحصیلِ علم کی راہ میں دیوار نہ بن سکا۔ ان کا اخلاص اور طلب صادق تھی کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی نے علومِ نبوت ان کے دامن میں انڈیل دیئے۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا جوہر اخلاص تھا جس نے ان کے نام کو روشن کر دیا۔ ان کی علمی و دینی زندگی کی تعمیر میں اخلاص کا عامل سب سے زیادہ محرک نظر آتا ہے۔ اخلاص ہی نے ان کو دوام بخشا ہے اور ان کے

افادات اور فیوضات و برکات کو چہار دانگ عالم میں پھیلا دیا ہے۔

علامہ سمعانیؒ نے ارشاد فرمایا، **ابو موسیٰ ہارون بن عبد اللہ حمّال** بھی بہت بڑے عالم، عابد، محدث اور کامیاب استاذ تھے۔ اوائل میں بزازی کا کام کیا، کپڑے کی تجارت کی مگر بعد میں یہ کام چھوڑ دیا اور لوگوں کا سامان اور اسباب ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کی مزدوری اور باربرداری کا پیشہ اختیار کیا اس سے جو اُجرت ملتی تھی خود اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتے تھے مگر سرمایہ داروں کی بلند عمارتوں اور بڑی بڑی ڈیوڑھیوں کی طرف کبھی آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا۔

علم و فضل اور ذہانت و ذکاوت کی فطری دولت سے اللہ تعالیٰ نے مالا مال کر دیا تھا، ان کی عظمتیں اس قدر بڑھیں کہ اپنے اور اغیار سب اس کے قائل تھے۔ وجہ صرف یہ تھی کہ ان کی پُشت پر اخلاص کی ایسی زبردست قوت کار فرما تھی، جس نے قیامت تک ان کو زندہ و جاوید بنا دیا۔ ان کے اساتذہ میں اکابر اہلِ علم حضرت سفیان بن عیینہؒ، سیار بن حاتمؒ، معن بن عیسیٰؒ، رداح بن عمارہؒ، ابو عاصمؒ، ابو عامر عقدیؒ کے نام زیادہ مشہور ہیں۔ امام حربیؒ ان ہی کی صداقت اور سچائی کے بارہ میں فرمایا کرتے تھے کہ:۔

”اگر بالفرض جھوٹ بولنا حلال اور جائز ہوتا تب بھی وہ ہرگز جھوٹ بولنے کے لیے آمادہ نہ ہوتے۔“

ابو عمران موسیٰ حمّال، ابو موسیٰ ہارون حمّال کے فرزند ارجمند، بڑے عالم، غازی و مجاہد اور حدیث کے امام تھے۔ اپنے والد کے صحیح جانشین اور وارث تھے۔ حمالی کا پیشہ تھا مگر ایثار و قربانی اور بلند عزمی نے ان کو بلند مقام عطا فرمایا۔ ان کی عزیمت اور اولوالعزمی نے غربت و افلاس، ناداری و خواری اور فقر و مزدوری اور حمالی کے باوجود انہیں آسمانِ علم کے ثریا تک پہنچا دیا۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ اگر یہ صفت کسی ادارہ یا قوم میں پیدا ہو جاتی ہے تو دنیا ان کے سامنے جُھک جاتی ہے اور اُن کی بالادستی کو ماننے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

شعبان ۲۹۴ھ میں موصوف اس دارِ فانی سے عازم اقلیم عدم ہوئے۔

چوتھے نمبر پر علامہ سمعانیؒ نے **رافع بن علی حمّال** کا تذکرہ فرمایا۔ موصوف باکمال

عالم اور عظیم فقیہ تھے، اور سب سے بڑا اعزاز یہ تھا کہ جار اللہ تھے، کعبۃ اللہ کے جوار میں زندگی گذارتے تھے۔ زندگی کا اکثر حصہ مکہ مکرمہ زادھا اللہ شرفاً میں گذارا مزدوری اور حمالی کے باوجود وہ علم وفضل کی نعمتِ عظمیٰ پر فائز ہوئے۔ وجہ یہ تھی کہ انہوں نے طالبعلمی کے زمانہ ہی میں خود کو علم پر عمل، عطائے علم پر شکر و امتنان کا عادی بنادیا تھا، اس مسئلہ میں ان کے قدم انبیاء عظام اور اولیاء کرام کے نقشِ قدم پر تھے۔ اپنے اخلاق کو اپنے اساتذہ کے اخلاق میں ڈھال دیا تھا صبر و شکر اور زہد و قناعت ان کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ تھا۔ طالبعلمی کے زمانہ ہی سے ان کے اخلاق وآداب، ان کے طور و طریق، ان کا رہن سہن، سب سنتِ رسولؐ میں ڈھل چکا تھا۔ انہوں نے تعلیم کے شروع کرنے سے پہلے اپنے مقاصد اور مقام کو پہچان لیا تھا۔ جب تحصیلِ علم کی راہ میں نکلے تو پڑھنے اور علمی استعداد بنانے اور اس میں نکھار پیدا کرنے میں لگے رہے، اسے مقصود اور نصب العین بنایا اور اس کے علاوہ دوسری طرف نگاہ اٹھاکر بھی نہ دیکھا۔

آپ خود بھی رجال اللہ سے تھے اور رجال کار کی تربیت پر توجہ بھی دیتے تھے۔ چنانچہ ابواسحٰق شیرازی اور ابویعلیٰ فراء نے آپ سے فیضِ صحبت، آپ سے شرفِ تلمذ، آپ کی خدمت و معیت اور آپ سے عقیدت و اطاعت کی بدولت فقہ اور حدیث میں امامت کا مقام پایا، اور استاذ کا یہ حال تھا کہ خود حمالی کرتے تھے، مزدوری کرتے تھے، اپنے اور اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر اپنے دونوں مذکورہ لائق تلامذہ کے لیے بھی اس میں حصہ رکھ لیتے تھے اور انہیں فکرِ معاش سے بے فکر رکھ کر یکسوئی اور یکجہتی سے تحصیلِ علم میں مگن رکھتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ پیشہ کوئی عیب نہیں، کوئی طعن نہیں، کوئی ملامت نہیں بلکہ عزت ہے، علم کی رفعت اور اس کے بقاء و تحفظ کا ذریعہ ہے، رضائے خدا اور رزقِ حلال کا بہترین وسیلہ ہے۔

ملاقات نمبر ۱۲

لکڑہاروں اور بڑھیوں کے طبقہ سے تعلّق رکھنے والے

اربابِ فضل و کمال

عشق و محبت میں سیری کہاں، علم و معرفت کی انتہا نہیں، فیض دانادہ کے نقطۂ آخر کا تصور بھی نہیں ہوسکتا۔ صبح کی حاضری اور استفادہ نے دوپہر کی نیند اچاٹ کردی۔ علم و معرفت کی کہانی اور پھر علامہ عبدالکریم سمعانیؒ کی زبانی ؎

دنیا بغیر عشق ہمیں ناپسند ہے
یوسف نہیں تو مصر کا بازار کیا کریں

یہ جلوۂ حُسن کا جمالِ عالمتاب تھا یا عشق و محبت کی صداقت کی کرامت تھی کہ حضرت سلطان العارفین بایزید رحمۃ اللہ علیہ کو اس قدر محو کررکھا تھا کہ کسی دوسری جانب فرصتِ یک نظر بھی نہ تھی۔ ہمارا حال بایزید والا نہ سہی مگر سمت تو وہی ہے اور راستہ بھی اسی انداز کا ہے۔ دراصل واقعہ یہ تھا کہ ایک مرتبہ حضرت بایزیدؒ کے شیخ حضرت سید جعفر بن امام کاظمؒ نے طاقچہ میں پڑی ہوئی کتاب مانگی تو بایزیدؒ نے جواباً دریافت کیا حضرت! کون سا طاقچہ؟ اس پر شیخؒ نے فرمایا ؎

در حجرہ زسالہا مکینی این طاق بر سر چرا نہ بینی

تو حضرت بایزیدؒ نے عرض کیا ؎

زاں دم کہ بخدمتِ حضورم از کثرتِ جلوہ غرق نورم

من فرصت یک نظر نیابم | کز حسنِ شما نظر بتابم
ہر لحظہ نگاہِ من بسُوییت | چشمِ من و آفتابِ رُوییت
از غیرِ وجودِ تو خبر نیست | جُز تابِ رُخت بکس نظر نیست

مجبور ز جذبِ حُسنِ یارم
دارم نظر و نظر نہ دارم

• مجھے بھی آج ذوالحجہ ۱۴۰۸ھ کی چوتھی تاریخ کو صبح کے بعد اب دوپہر کو پھر حضرت سمعانیؒ کے حضور باریابی کا شرف حاصل ہُوا۔ دلِ بیتاب کے ہاتھوں مجبور و معذور، دوپہر کا قیلولہ بھی صرف دو منٹ لیٹ کر سُنّت ادا کرلینے تک تو کرلیا، مگر آرام کہاں۔ یہ داستانِ محبت ہے، یہ دُنیا ہی دوسری ہے۔ یہ تو علم و مطالعہ اور استفادۂ فیض کا بازار ہے، یہاں کی تہذیب جدا ہے، اطوار جدا ہیں، یہاں کا رنگ و بُو جدا ہے۔ کسے کیا بتایا جائے کہ اس میں لطف و کیف کی کیسی بہاریں ہیں ؎

از لطف خلاقِ زمان | داریم ممتاز از جہان
وضعِ دگر طرزِ دگر | ذوقے دگر شوقے دگر

علامہ عبدالکریم سمعانیؒ سے ہماری تمام مُلاقاتوں کی روئیدادیں پڑھتے چلے جائیے "وضعِ دگر طرزِ دگر ذوقے دگر شوقے دگر" کی جھلکیاں نظر آتی چلی جائیں گی۔ ممکن ہے بعض دوستوں کو ہمارا یہ طرزِ تحریر اور افشائے راز ناگوار بھی ہو، بعض گوارا بھی کرلیں۔ تاہم نقطۂ اعتراض پھر بھی دیکھتے چلے جائیں، اور ممکن ہے ہماری طرح کے بعض شوریدہ حال اور از خود رفتہ آشفتہ سروں کو اس داستان کا سارا سراپا ہی حسن و جمال کا مرقع نظر آئے اور بعض ہوشیاروں کو ہماری دیوانگی پر ہنسی بھی آجائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ؎

سودا نہیں جنوں نہیں دیوانہ پن نہیں
جینا ہے گر یہی تو یہ جینے کا فن نہیں
راحت سے احتیاط اور مصیبت سے ارتباط
عاجز یہ اور کیا ہے جو دیوانہ پن نہیں

اپنی طبعی افتاد، کچھ دیوانگی اور آشفتہ سری، کچھ جنون اور از خود رفتگی نے پھر سے علامہ عبدالکریم سمعانیؒ کی الانساب کے آئینہ میں ان کی زیارت و ملاقات کا موقع بہم پہنچا دیا۔ استفادہ اور کسب فیض کے یہ لمحات ہیں جو ہر لحاظ سے قیمتی اور زندگی بھر میں یاد رکھنے کا سرمایہ ہیں ؎

وہ رات اہلِ گلستاں کبھی نہ بھولیں گے
جو زیرِ سایۂ زلفِ بہار گذری ہے

حاضرِ خدمت ہوا کتابی اور مطالعاتی ملاقات میں علامہ سمعانیؒ نے پھر اپنی گرانقدر تالیف الانساب کا صفحہ ۱۷۱ کھول دیا، شہ سرخی حطاب تھی۔ آج انہوں نے ہمیں علماء اور فضلاءؒ جو حطابی کا کاروبار کرتے تھے اور خدمتِ دین میں مصروف تھے، کا تذکرہ سنانے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ حطاب اس شخص کو کہتے ہیں جو جنگل اور صحراء سے لکڑیاں کاٹ کاٹ کر شہر و بازار میں لاتا ہے اور مناسب داموں فروخت کرتا ہے۔ یہ بھی محنت و مزدوری اور رزق حلال کا ایک اچھا پیشہ ہے۔ اس پیشہ کو بھی بڑے بڑے ائمہ، فضلاء اور مشائخ نے اختیار کیا اور اپنے ہاتھوں سے رزقِ حلال کی پاک کمائی سے اپنے بچوں کا پیٹ پالا، اُردو میں انہیں لکڑ ہارے کہتے ہیں۔ واہ یہ دین کا معجزہ ہے اور اسلام کی آفاقی صداقت کی نشانی ہے کہ لکڑ ہاروں میں دینِ اسلام اور علمِ دین کی روشنی پھیلی ہے اور ان کے جھونپڑے علمِ دین کی دولت سے رشکِ فردوس بنے ہیں۔

ارشاد فرمایا زید بن عبدالحمید حطاب اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور پارسا بزرگ تھے، ان کی علمی عظمتوں کی ایک دُنیا قائل تھی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے تلامذہ میں سے تھے۔ اُن سے اور اہلِ مدینہ سے آپ نے روایت کی ہے۔ بے چارے علم و فضل کے بلند مقام پر فائز ہونے کے باوجود لکڑ ہارے تھے۔ جنگلوں سے لکڑیاں کاٹ کاٹ کر شہر اور بازار میں بیچتے تھے، اس سے جو کمائی ہوتی اسی قوتِ لایموت پر گذر اوقات کرتے۔

امام اوزاعیؒ نے لکڑ ہاروں میں انہیں تابعی قرار دیا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے عمل اور کردار سے اپنی عزت اور وقار کا تحفظ کیا کہ علماء کی عزت علم کی عزت ہے۔ زندگی بھر

سعید اور صابر بن کر رہے۔ بنگلوں اور کوٹھیوں کا تصور بھی ان کے ہاں نہ تھا، لباس کے معیار وہ کب جانتے تھے، انہیں تو صرف اپنے ایک مقصد اور منزل سے عشق تھا، وہ علم پر عمل اور خدا کی رضا کا حصول تھا۔ خدا نے اس طلبِ صادق کے بدلے انہیں صاحبِ کمال بنا دیا تو دنیا و آخرت میں سرخروئی کی سعادتمندیوں سے سرفراز ہوئے۔

ابوبکر محمد بن حسین لکڑہارے کا تذکرہ ہوا تو علامہ سمعانیؒ نے بتایا کہ موصوف ۲۸۲ھ میں پیدا ہوئے ۳۴۸ھ میں وفات پائی۔ علم حدیث کی تحصیل اکابر و اعیانِ علم سے کی۔ ان کے اساتذہ میں ابوخلیفہ فضل بن حباب، جعفر بن محمد فریابی، احمد بن حسین اور حسین بن اسحٰق صوفی زیادہ مشہور ہیں۔ تحقیق اور مطالعہ ان کی طبیعتِ ثانیہ تھا۔ تدریس طبیعت کا جزو بن گئی تھی۔ علمِ دین کا حصول ان کا جینا اور مرنا تھا۔ قدیم ذخیروں اور دفینوں کو کھنگال کر علم و معرفت کے گوہر نایاب لٹواتے رہے۔ ان کی جامع شخصیت کی نکھار و بہار کے پس منظر میں وہ یقین کی دولت تھی جو ان کے دل و دماغ کی تہہ میں پیوست ہو چکی تھی۔ علم کی تدریس تھی یا یقین و معرفت کی ایک مقناطیسی اور برقی قوت جس نے سینکڑوں اور ہزاروں کو متاثر کیا۔ ابوالقاسم عبداللہ بن عمر بن بقال، حافظ ابونعیم احمد بن عبداللہ جیسے اکابر ارباب علم و فضل اور اساطینِ علم نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔

ابوایوب سلیمان بن عبداللہ رقی لکڑہارے تھے۔ خیر و برکت، صدق و صفا کا مجسمہ تھے۔ یہی پیشہ تھا یہی کاروبار اور یہی ذریعہ معاش تھا مگر مقصد و منزل اور مطمح نظر خدمتِ دین اور اشاعتِ علم رہا۔ اپنے علم، عملِ صالح اور صلاح و تقویٰ اور اسلامی سوسائٹی کی تشکیل اور اسلامی معاشرہ کی تعمیر میں دلچسپی کی وجہ سے علمی اور دینی حلقوں میں بڑی عزت اور عبرت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی درس گاہ طالبین و معتقدین سے ہر وقت بھری پڑی رہتی تھی۔ مدرسہ میں طلبہ کی کثیر تعداد ہمہ وقت تحصیلِ علم میں مصروف رہتی۔ ان کا اعمالنامہ روشن اور پاکیزہ تھا۔ عقیدہ اور ایمان کی پختگی اور دعوت و خدمتِ علم اور اعلاء کلمۃ اللہ کی وجہ سے انہیں سخت آزمائشوں سے بھی گذرنا پڑا مگر وہ ہر حال میں راسخ العزم، ثابت القدم اور صابر و شاکر رہے۔

ابوایوب سلیمان لکڑہارے حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے تلمیذِ خاص ہیں آپ کی ثقاہت اور دیانت کے لیے یہ بات کافی ہے کہ جب آپ مکۃ المکرمہ تشریف لے جارہے تھے تو راستے میں کوفہ کے مقام پر امام ابو حفص عمر بن احمدؒ نے آپ سے حدیث کا سماع کیا اور ہمیشہ اس کو فخر و امتیاز کے ساتھ بیان کیا۔

اسلام کا یہ معجزہ نہیں تو اور کیا ہے کہ بے چارے لکڑہارے بھی اسلامی علوم و معارف کی مسند پر جلوہ گر نظر آتے ہیں اور قرآن و حدیث کے علوم و معارف اور کنوز و مخازن کی امانت کے محافظ اور ضامن بن کر امامت و سیادت اور عزت و شرافت کے بلند مقام کو پہنچے ہیں۔ اور پھر جب تاریخ پڑھیں تو حیرت ہوتی ہے اور خدا کی عظمتیں یاد آجاتی ہیں کہ ان لکڑہاروں نے واقعۃً جنگلوں کو بھی دارالعلوم اور جامعات بنا دیا تھا ؎

جلتا ہے چراغوں میں لہو اہلِ وفا کا
سنتے ہیں کہ رنگین تیری شام بہت ہے

تذکرہ تو لکڑہاروں کا چل رہا تھا، لکڑی اور حطابی کی مناسبت سے نجاری (بڑھئی) کا ذکر چل نکلا تو بڑا مزا آیا، لطف و کیف کی انتہا نہ رہی جب علامہ سمعانیؒ نے الانساب کا صفحہ ۲۵۳ بھی اپنے دل کی طرح کھول کر سامنے رکھ دیا۔ دیکھا کہ اہلِ علم ہیں، اربابِ فضل و کمال، صاحبانِ دین و دانش، محدثین ہیں، مفسرین ہیں، فقہاء اور ائمہ وقت ہیں سب بڑھئی تھے، سب اپنے ہاتھوں سے لکڑیاں تراشتے، لکڑی کا سامان بناتے، نجاری کے پیشہ پر فخر کرتے تھے۔ آج ایک محفل جمائے جلوہ آرا ہیں۔ دنیا میں بڑھیوں کا کام کرتے اور رزقِ حلال کماتے تھے مگر علم و معرفت کے میدانوں میں کسی بھی طبقہ سے کم حصہ نہیں لیا، بڑھیوں نے بھی کاروانِ علم و فضل کے شانہ بشانہ چل کر منزلِ مقصود پائی ہے ؎

یہ دھوم آپ کی زنجیر کی نہیں ہوتی
ہمارا پاؤں اگر درمیان نہیں ہوتا

صالح بن دینارؒ نجار تھے، بڑھیوں کا کام کرتے تھے، مدینہ منورہ میں قیام تھا سکونت بھی وہیں کی تھی۔ تابعیت کے شرف سے مشرف تھے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ کے

خصوصی تلامذہ میں سے تھے۔ ان کا خاص وصف یہ تھا کہ وہ قناعت وسادگی، زہد وضبطِ نفس کو ترجیح دیتے تھے۔ جاہ ومنصب کے سحر وطلسم سے آزاد ہونے اور زندگی کے رنگین، خوشنما اور کھوکھلے مظاہر سے بے اعتنائی کرتے تھے۔ ان کے نزدیک کثرتِ معلومات، علم ومطالعہ کی زیادتی، لسانی طلاقت، زورِ خطابت اور آرائش وزیبائش، اسلامی انقلاب کا ذریعہ نہیں بلکہ زندہ ضمیر اور اصلاح وتقویٰ کے بغیر رضائے خدا کا حصول ناممکن سمجھتے تھے، وہ انسانوں میں ایسے دل پیدا کرنا چاہتے تھے جو زندگی اور ایمان ویقین کی دولت سے مالا مال ہوں، اس میں اپنے اور پرائے کی تمیز کو ناروا سمجھتے تھے ؎

اپنا تو کام ہے کہ جلاتے چلو چراغ
رستے میں خواہ دوست کہ دشمن کا گھر ملے

ابوبکر محمد بن جعفرؒ بھی نجار تھے، بڑھئی ہونا ان کے لیے قابلِ فخر نسبت تھی۔ ثقہ بزرگ، محدث اور حدیث کے کامیاب استاد تھے۔ قرآنِ کریم کے ساتھ خصوصی شغف تھا، حفظ القرآن کا خصوصیت سے اہتمام کرتے تھے۔

ابو محمد نحویؒ تو معروف ہی ابن النجار تھے، کوفی تھے، ثقہ اور جید عالم تھے۔ علمِ حدیث کی تحصیل کا شوق ابھرا تو اپنے وقت کے عظیم اور مشاہیر محدثین محمد بن حسین اشنانی، عبدالرحمٰن بن ثابت حریری، اسحٰق بن محمد، ابورؤف احمد بن بکرؒ، ابوبکر محمد بن یحییٰ صوفی جیسے عظیم اساتذہ حدیث کی خدمت میں پہنچے، زانوئے تلمذ تہہ کیا اور اُس وقت تک سر نہ اٹھایا جب تک علم وفضل میں کمال حاصل نہ کرلیا، پھر تدریسِ حدیث اور خدمتِ علم کے ساتھ ساتھ بڑھیوں کا کام کیا، حمیتِ اسلامی کے جذبہ سے سرشار تھے۔ قرآن وحدیث اور اجتہاد و استنباطِ مسائل میں اللہ تعالیٰ نے ان کو دیدہ وری اور نکتہ سنجی کی غیر معمولی دولت سے نوازا تھا، اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر کرم یہ فرمایا کہ ان کو خدمت واشاعتِ علم کے لیے ایک بے چین روح اور مضطرب قلب مرحمت فرمایا تھا۔ ان کی ذہانت وعالی ظرفی، اُن کی اولوالعزمی وثابت قدمی اور حوصلہ مندی اور شفقت اور ہمدردی نے انہیں بڑا بنادیا اور اس میں نجاری آڑے نہیں آئی۔ ابوالقاسم زہری، محمد بن احمد عکبری ان کے درِ دولت

اور درسگاہِ علم میں پہنچے اور کسبِ فیض کو سعادت و سند سمجھا۔ اپنے زمانہ کے عظیم انسان اور شیخ الکوفہ تھے۔ ۳۰۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۴۰۲ھ میں کوفہ میں اُن کی وفات ہوئی۔

اس کے بعد علامہ سمعانیؒ نے **ابوسلیمان بن داؤد نجار** کا ذکر چھیڑا، ارشاد فرمایا کہ موصوف یمامی اور بصری تھے مگر نجاری کی نسبت سے زیادہ مشہور تھے۔ عمارہ بن عقیمہ، یحییٰ بن مروان اور ابوتمامہ سے علمِ حدیث کی تحصیل اور تکمیل کی۔ ابوزرعہ اور ابوحاتم رازی جیسے جبالِ علم و فضل نے اُن سے تلمذ کو اپنے لیے فخر و امتیاز کا ذریعہ اور اخروی سعادتوں کا وسیلہ قرار دیا۔ زمانۂ طالبعلمی سے ان کی نگاہ بلند مقام پر رہی۔ اپنے محدود اور مخصوص ماحول میں رہ کر بھی انہوں نے اپنے خداداد کمالات، جوہرِ ذاتی اور استعداد و صلاحیت پر محنت کی اور اسے چمکایا بڑھایا اور علمی و رُوحانی بلندیوں پر اپنا نشیمن بنایا۔

انہوں نے اپنی ضروریات کے لیے تو چھُٹی کر دی اور بعض اوقات علمی اور دینی ضرورت کے بپیشِ نظر بڑھئی کے کام سے چھٹی کر لی، فقر و فاقہ، عسر و افلاس تو برداشت کر لیا مگر تحصیل و اشاعتِ علم سے چھٹی نہیں کی ؎

مکتبِ عشق کے انداز نرالے دیکھے
اُس کو چھُٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

دُنیا کے مسافر، ہر طبقہ سے تعلق رکھنے والے اور ہر منزل پر جانے والے مسافر کے لیے تو آرام ہے، مگر علم کے اس مسافر نے اپنے اوپر راحت حرام کر لی تھی جس کی برکت سے انہیں کمالات حاصل ہوئے۔ امتیاز و اختصاص اور صدق و خلاص کی ایسی لازوال دولت حاصل ہوئی کہ جو سرمایہ دار کروڑوں کے صرفہ سے بھی نہیں خرید سکے۔ موصوف اربابِ خیر و اصلاح کے شیخ و پیشوا مانے جاتے تھے۔ بڑے بڑے علماءِ وقت نے اُن سے پڑھا اور پھر یہ سلسلہ در سلسلہ چلتا رہا۔

ابوحاتمؒ نے ایک مرتبہ اُن کے بارے میں یحییٰ بن معینؒ سے کہا کہ میں نے اُن کو بصرہ میں بہت عافیت اور آرام کی حالت میں چھوڑا ہے۔ اِس کے بعد یحییٰ بن معین نے ان کی زبردست تحسین وتعریف کی اور فرمایا کہ تم یُوں کہو کہ میں نے یمامہ میں ان سے زیادہ علم حدیث کا سمجھنے والا کسی کو نہیں پایا۔

ملاقات نمبر ۱۳

شکرسازوں اور شکر فروشوں کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے

اربابِ علم وکمال

بعض دوستوں کے اصرار، اکابر کے حسنِ ظن وتائید اور بعض اساتذہ حضرات کے حکم کے پیشِ نظر حضرت علامہ عبدالکریم سمعانی رح سے ملاقاتوں کا جو سلسلہ تھا اُسے مستقل کتابی شکل دینے کے لیے باقاعدہ کتابت کے لیے اس کے مسودات کاتب کے حوالے کر دیئے، مگر تاخیر ہو گئی۔ محرم الحرام ۱۴۰۹ھ کی دس اور اگست ۱۹۸۸ء کی چوبیسویں تاریخ ہے۔ مہینہ سے زائد عرصہ ہو گیا کہ ابھی تک کوئی تسلی بخش اطلاع نہیں آئی، کاتب بھی گم اور مسودات بھی لاپتہ۔ اسی تصور میں تھا، فکر واندیشے پریشان کیے ہوئے تھے، تاہم موضوع کی اہمیت اور اربابِ علم وکمال کے تذکروں پر دل بہرحال مطمئن ہے کہ انشاء اللہ سرخروئی اور نجات کا ذریعہ ہوں گے۔ کچھ ایسے ہی خیالات تھے۔ اپنے موضوع، فن اور زیرِ بحث عنوان کی مناسبت سے حضرت علی المرتضیٰ رض کے دو اشعار وردِ زبان ہو گئے اور بغیر کسی پہلے سے ارادہ اور عزم کے دل ودماغ کی ہم آہنگی میں گنگنانا شروع کر دیا، لیجئے آپ بھی محظوظ ہو جائیے ؎

وَقَدْرُ كُلِّ امْرِءٍ مَا كَانَ يُحْسِنُهُ   وَلِلرِّجَالِ عَلَى الْأَفْعَالِ أَسْمَاءُ
وَضِدُّ كُلِّ امْرِءٍ مَا كَانَ يَجْهَلُهُ   وَالْجَاهِلُونَ لِأَهْلِ الْعِلْمِ أَعْدَاءُ

(ترجمہ) آدمی کا رتبہ وہ ہنر ہے جس میں وہ کامل ہوتا ہے اور ہنر ہی آدمی کو ممتاز کرتا ہے اور آدمی جس بات سے ناواقف ہوتا ہے

اس کا مخالف ہوتا ہے اس لیے جاہل لوگ اہلِ علم کے دشمن ہوتے ہیں"۔
اشعار کے ساتھ ان کا ترجمہ اور مضمون بھی دل و دماغ اور خیال و تصور کا مدد جزو بن گیا۔ تنہائی اور خلوت بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، بندے کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے، اس میں کتنی لذتیں اور کتنی کیفیتیں ہیں، کیا سکون ہے، کیسی بہار ہے، اشعار گنگنائے جا رہے ہیں اور چشمِ تصور اور سمندِ خیال نے کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اشعار میں کسب و ہنر کی اہمیت و فضیلت اور اربابِ علم و کمال کے رُتبہ و مقام اور جُہّال کی ضد و ضلالت، تینوں مضامین کے اجتماعی تصور نے پھر قلب میں حضرت امام سمعانیؒ سے ملاقات و استفادہ کا داعیہ پیدا کر دیا۔ "الانساب" ساتھ کے دوسرے کمرے سے اٹھا لایا، ورق گردانی شروع کر دی۔ پیشوں کے انساب میں آج کون سے طبقہ سے تعارف اور استفادہ ہو؟ انتخاب مشکل تھا کہ یکایک یہ خیال پیدا ہو گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو اِن دو اشعار میں فضیلتِ کسب و ہنر، اہمیتِ علم و فضل اور وطیرۂ جُہلاء اور مستحسن طریقہ علماء کی نشاندہی فرمائی ہے، اس کا پس منظر بھی جان لینا چاہیئے، اشعار بھی دو ہیں یا اس سے زائد بھی ہیں؟ مضمون تو بہرصورت عمدہ ہے اور پھر اپنے موضوع سے متعلق بھی۔ ذوق کا رُخ بدلا "الانساب" اپنی جگہ رہ گئی اور اشعار کی تلاش شروع ہو گئی، دار العلوم کا کتب خانہ چھان مارا، اپنی ذاتی لائبریری میں پڑی ہوئی کتابوں کے اُلٹنے پلٹنے میں بھی کافی وقت صرف ہو گیا مگر کچھ نہ ملا، تھکن نے چُور چُور کر دیا، مایوسی بھی ہو گئی اور کچھ عوارض بھی ایسے ہیں کہ ہمت بھی ہارنے لگی، مگر اچانک قدرت نے رہبری کی اور مایوسی کے بعد اپنی ذاتی لائبریری میں ایسی جگہ سے کتاب مل گئی جہاں چشمِ تصوّر کا گذر بھی نہ تھا، اس کے بعد کیا حالت ہوئی؟ بیان سے باہر ہے۔ کتنا مزا آیا، کتنا لطف حاصل ہوا، کیسا سرور اور کتنی خوشیاں، دولتِ کونین لٹا دیجئے مگر ایسی لذتیں حاصل نہیں ہو سکتیں۔

آپ کو حیرت ہو گی کہ چند اشعار جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مل گئے تو کیا بہاریں آگئیں، مگر کیا سمجھایا جائے؟ ہم تو پندرہویں صدی کے گنہگار ہیں، اکابر اور اسلاف سے

نسبت کیا، مگر الحمد للہ دین زندہ ہے اور نظام اور پیغام اس کا مسلسل ہے، دل کا شیشہ اور عمل کا آئینہ گناہوں نے گدلا کر دیا ہے، پر کچھ بھی ہو مگر الحمد للہ کہ عکس لینے میں اپنے اکابر اساتذہ اور اسلاف وائمہ امت کے جلوۂ جہاں آراء کی طرف متوجہ ہے۔ اب تو کتابیں چھپتی ہیں، چھاپے خانے ہیں، اعلیٰ طباعتیں ہیں، مطالعہ گاہیں ہیں۔ ہمارے اسلاف کے زمانے میں تو ان چیزوں کا بھی فقدان تھا مگر اُن کے دلوں میں علم کی طلب تھی، محبت تھی، عشق تھا، ماسوا علم کے ان کے عشق کی آگ نے سب کچھ کو جلا کر خاکستر بنا دیا تھا۔ اَلْعِشْقُ نَارٌ تَحْرِقُ مَا سِوَا الْمَطْلُوْب۔ اُن کی پوری زندگی اس کا مظہر تھی۔ بڑے بڑے جانگسل نوازلات اور حوصلہ فرسا حوادث ان کے دلوں میں علم کی جانب سے تفرقہ یا تکدر یا تعب و بے رغبتی پیدا کرنے میں قاصر تھے، وہ بعض اوقات اپنے کاموں میں، مشاغل میں، کھیتوں میں، دوکانوں میں، سلائی میں، مزدوری میں، کتابت میں، جلد بندی میں، جوتے گانٹھنے میں، گارا بنانے میں مصروف ہوتے تھے مگر قلب ان کا علم کی جانب رہتا تھا۔

قارئین کو حضرت علیؓ کے بقیہ اشتعلد کا انتظار ہو گا اور مجھے دیوانگی نے دوسرے بکھیڑوں میں ڈال دیا ہے، اور دل کی یہ کیفیت ہے کہ اکابر کے علمی ذوق، ان کے شوق اور علمی وارفتگی کی کیفیات، کس طرح ہو سکے کہ اپنے احباب و مخلصین کے دلوں میں انڈیل دوں اس لیے بات سے بات نکلتی اور نوکِ قلم پر مضطرب ہو کر آپ کے سامنے استحقاق تو جہ بن کر گذر جاتی ہے۔ اب وہ حالات کہاں ہیں جب اہلِ علم کی کیفیت "دل بیار دست بہ کار" کی ہوا کرتی تھی اور انہیں ایک ایک مسئلہ اپنی جانِ عزیز سے بھی زیادہ عزیز ہوا کرتا تھا۔

ابو عمرو بن العلاء جو اپنے زمانے کے ادب کے امام تھے کسی وجہ سے سفاکِ زمانہ حجاج بن یوسف سے اَن بن ہو گئی اور یقین ہو گیا کہ اگر پکڑا گیا تو وہ قتل سے دریغ نہیں کرے گا، تو اس کے خوف سے صحرائے عرب کو نکل گئے۔ اب ایک جگہ ٹھہاؤ کہاں! جنگلوں اور صحراؤں میں بھاگے پھرتے تھے، تلاش تھی ایک ادبی اور علمی مسئلہ کی، ایک لُغت کی صحت کا تجسس تھا کہ آیا لفظ فرجہ (بمعنی کشائش) فا کے ضمہ (پیش) کے ساتھ پڑھا جاتا ہے یا فتح (زبر) کے ساتھ، اِدھر جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں

اُدھر معنوی تحقیق میں بادیہ پیمائی شروع ہے۔ اچانک حسنِ اتفاق سے ایک جنگل سے گذر رہے تھے کہ کسی بدوی عرب کو گنگناتے ہوئے سُنا، کان لگایا تو وہ یہ شعر کہہ رہا تھا ؎

ربما تجزع النفوس من الامر

لہٗ فَرجَۃَ کحل العقال

(ترجمہ) "کئی مرتبہ نفوس کسی امر سے پریشان ہو جاتے ہیں مگر اس کا حل رسّی کی گرہ کی طرح اچانک ہوتا ہے۔"

فَرجہ کو اس نے فا کے فتح (زبر) کے ساتھ پڑھا، بدوی نے یہ شعر بھی پڑھا اور ابوالعلاء کی طرف مخاطب ہو کر یہ خبر بھی سُنادی کہ تمہیں معلوم ہے کہ ظالم حجاج مر گیا ہے۔

ابوالعلاء کی سُنیئے جس کے خوف سے وہ جنگلوں اور صحراؤں میں چھپا چھپا پھرتا تھا وہ جانی دشمن مر گیا، گویا ابوالعلاء کو نئی زندگی مل گئی دوسری طرف وہ ایک لغوی تحقیق کہ فرجہ کے فا کی زبر ہے یا پیش ہے کے تجسس اور طلب میں بے قرار اور مضطرب تھا۔ اس ظالم حجاج کی موت کی خبر سُنانے والے نے اس کی تحقیق بھی ہو گئی اور مسئلہ حل ہو گیا۔

ابوالعلاء کہتے ہیں مجھے بیک وقت دو خوشیاں حاصل ہوئیں لغوی مسئلہ کی تحقیق ہو گئی جانی دشمن کی موت کی خبر مل گئی مگر اس خوشی میں میں یہ تمیز نہ کر سکا کہ آیا میں کس بات سے خوش ہوں، لفظ فرجہ کے تلفظ کی تحقیق اور صحت معلوم ہو جانے سے یا اپنے جانی دشمن کی موت کی خبر پانے سے۔

آپ اس حکایت کو غور سے پڑھیں کہ اس شیفتۂ علم و تحقیق کے نزدیک ایک ایک علمی کیا لغوی مسئلہ بھی جان عزیز سے کسی طرح بھی کم عزیز نہیں تھا۔ یہی ذوق تھا کہ ابوالعلاء اپنے فن کے امام قرار پائے۔

اصل بات یہاں سے چل نکلی تھی کہ شاید آپ کو شبہ ہو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چند اشعار کے مل جانے سے دلی کیفیتیں کیسے بدلیں، بہاریں کہاں کی؟ خلوت میں جلوت کا سماں مبالغہ ہو گا ــــــ مجھے تو اپنے ذوقِ طلب میں فقدانِ اخلاص کا احساس ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ عدم اخلاص کا احساس بھی اخلاص ہے، خدا تعالیٰ اس کی واقعی حلاوتوں سے سب کے

کام و دھن کو عذوبت نصیب کرے۔ اپنے اسلاف اور اکابر کے سوانح اور تذکروں کو پڑھیے تذکرۃ الحفاظ کا مطالعہ کیجیے، ابن خلکان کو اٹھائیے، سلک الدرر کو دیکھئے، علم و مطالعہ اور تحقیق و تجسس اور اسلاف کے عشق و محبتِ علم کے عبرت انگیز واقعات سے چشم عبرت کو سرمۂ بصیرت مل جاتا ہے۔

ابو عبید بن سلام کا واقعہ یاد آیا، ایک مرتبہ اپنے حلقۂ تلامذہ سے دورانِ درس ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنی کتاب غریب الحدیث کی تصنیف میں چالیس برس صرف کیے۔ اس کی تصنیف کے دوران میں نے اسفار کیے، دور دراز اکابر کی خدمت میں پہنچا اور اکثر فوائد مجھ کو لوگوں سے باتوں باتوں میں ہاتھ لگ جاتے تھے اور میں ان کو موقع موقع سے محل اور مقام کی مناسبت سے کتاب میں درج کرتا جاتا تھا۔ ان علمی فوائد، توضیحی نکات اور مسائل کی تحقیقات سے مجھے اس قدر مسرت اور خوشیاں حاصل ہوتی تھیں کہ میں ساری ساری رات فرطِ مسرت سے جاگتا رہتا تھا اور تم لوگ چار، پانچ مہینے میرے پاس آکر رہتے ہو تو پھر کہتے ہو کہ ہم بہت رہے اور ہم نے علم کے لیے گویا بڑی قربانی دی۔

احقر نے اپنی تالیف "علماء احناف کے حیرت انگیز واقعات (جلد دوم)" میں امام محمدؒ کے تذکرہ کے ذیل میں ایک ماہ قبل ذی الحجہ کی تعطیلات میں امام ذہبیؒ، صیمریؒ، اور امام زاہد الکوثریؒ کے حوالے سے یہ واقعہ بھی لکھ دیا ہے کہ ابو حازمؒ نے امام محمدؒ کے نواسے سے روایت کی ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنی والدہ سے دریافت کیا کہ گھر میں نانا جان (امام محمدؒ) کے معمولات کیا تھے؟ میری والدہ نے فرمایا خدا کی قسم! میرے بچے وہ اس گھر میں کتابوں کے ڈھیر کے سامنے بیٹھے رہتے تھے، ان کا مشغلہ صرف کتب بینی اور مطالعہ و تحریر رہ گیا تھا، کسی سے بات نہیں کرتے تھے، جب ضرورت پڑتی تو اہلِ خانہ سے صرف ابروئے چشم اور انگلیوں کے اشارہ سے بات کر لیا کرتے تھے۔" بلکہ صیمریؒ اور خطیبؒ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ امام محمدؒ نے گھر والوں سے کہہ رکھا تھا کہ ضروریاتِ دُنیاوی کے سلسلہ میں مجھ سے بات چیت نہ کیا کرو، کچھ نہ کہا کرو، جتنے روپے یا جس چیز کی ضرورت ہو میرے وکیل اور مختار سے لے لیا کرو، کیونکہ اس طرح میرا وقت ضائع ہوگا اور میں

یکسوئی قلب سے اپنا کام جاری رکھ سکوں گا۔

حضرت علیؓ کے بقیہ اشعار تو آپ کو بھی سنائے دیتا ہوں مگر امام محمدؒ کے مذکورہ ذوقِ علم میں انہماک کے دلچسپ واقعہ سے ملتا جلتا امام زہریؒ کا ایک عبرت انگیز واقعہ بھی زیادہ مشہور رہے لکھا ہے، امام زہریؒ کا مطالعے کے وقت یہ عالم ہوتا تھا کہ اِدھر اُدھر کتابیں بکھری پڑی ہوتی تھیں وہ اُن کے مطالعہ میں ایسے مصروف ہوتے تھے کہ انہیں دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہیں ہوا کرتی تھی اُن کی اہلیہ کو کب یہ گوارا تھا کہ ان کے سوا کسی اور کے لیے بھی اس قدر گنجائش ان کے شوہر کے دل میں ہو، اکثر بگڑا جایا کرتی تھیں اور ایک روز جب ان کے مطالعاتی انہماک اور اپنے سے بے التفاتی کی شکایت کرنے لگی تو بے چاری کے منہ سے بے اختیار یہ کلمہ بھی نکل گیا کہ:-

وَاللّٰهِ لَهٰذِهِ الْكُتُبُ اَشَدُّ عَلَيَّ مِنْ ثَلٰثِ ضَرَائِرَ۔	مجھے اللہ کی قسم! یہ تمہاری کتابیں مجھ پر تین سوکنوں سے زیادہ بھاری ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اشعار پلٹنے کے بعد کتاب الانساب کا صفحہ ۵۵۳ سامنے ہے، تذکرہ نجاروں کا ہے جس کو اُردو میں ترکھان اور بڑھئی کہتے ہیں۔ اللہ اللہ! فہرست پر ایک نظر ڈالیے، دریائے حیرت میں ڈوب جائیے، اس طبقے میں کیسے کیسے عابد، عالم، زاہد، فقیہہ، مجتہد، امام، محدث، مفسر اور مبلغ اور علم کے پروانے اُٹھے، اُبھرے، پھیلے اور خود کو شمعِ علم پر قربان کر دیا۔ اپنی ساری کمائی، ساری متاع اور ساری پونجی اس راہ میں تج دی کسب و ہُنر نے رزقِ حلال مہیا کر کے قوتِ لا یموت پر گذر اوقات کا سہارا دیا اور علم و کمال نے انہیں باکمال بنا دیا، کسب و ہُنر ہو اور علم و کمال اور ساتھ ساتھ خدا اپنے ہاتھوں کی کمائی کا رزقِ حلال بھی دے دے، بس پھر کیا ہے! دنیا بھی ایک بہشت ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسی مضمون کو اپنے مندرجہ بالا دونوں اشعار میں بڑے پیارے انداز میں بیان فرمایا ہے، لیجئے اس کے پس منظر کے اشعار جو تلاشِ بسیار کے بعد ملے ان کی چاشنی و حلاوت اور عذوبت آپ کو بھی انتظار کے بعد لطف و کیف میں دوبالا ہو کر بھلی لگے گی۔

الناس من جهة التمثال أكفاء — أبوهم آدم والأم حواء

شکل وصورت میں تمام لوگ یکساں ہیں۔ کیوں کہ سب کے باپ آدم اور ماں حوا ہیں

نفس كنفس وأرواح مشاكلة — وأعظم خلقت فيهم وأعضاء

سب میں ایک ہی طرح کی روح ہے اور روحیں بھی مشابہ ہیں سب میں ہڈیاں ہیں اور جوڑ ہیں

فإن يكن لهم من أصلهم حسب — يفاخرون به فالطين والماء

آدمی اپنی اصلیت پر اگر فخر کریں تو اصلیت سب کی مٹی اور پانی ہے

ما الفضل إلا لأهل العلم إنهم — على الهدى لمن استهدى أدلاء

فضیلت تو صرف اہلِ علم کو ہے، اور وہی ہدایت طلب کرنے والوں کے رہنما ہیں

وقدر كل امرئ ما كان يحسنه — وللرجال على الأفعال أسماء

آدمی کا رتبہ وہ ہنر ہے جس میں وہ کامل ہے اور ہنر ہی آدمی کو ممتاز کرتا ہے

وضد كل امرئ ما كان يجهله — والجاهلون لأهل العلم أعداء

آدمی جس بات سے ناواقف ہوتا ہے اس کا مخالف ہوتا ہے اسی لیے جاہل لوگ عالم کے دشمن ہوتے ہیں

امام سمعانیؒ کی مجلسِ روحانی میں دامنِ استفادہ پھیلایا تو انہوں نے حسبِ سابق بڑی عنایت اور مہربانی فرمائی اور آج بھی جلیل القدر اربابِ علم وکمال کے تذکرہ اور بیانِ احوال سے مشرف فرمایا جو نجاری اور بڑھیوں اور دقاقوں (آٹا بیچنے کا کاروبار کرنے والے) کے پیشہ رزقِ حلال سے اپنے پیٹ پالتے اور دنیا میں زندہ رہ کر خدمتِ علم کرتے، اس طبقے سے بھی بہت سے علماء کرام پیدا ہوئے جنہوں نے علومِ اسلامیہ کی خدمت واشاعت میں کسی بھی طبقہ سے کم حصہ نہیں لیا ہے بلکہ کاروانِ علم کے شانہ بشانہ چل کر منزلِ مقصود پائی ہے۔

علمِ طب کے مشہور امام اور عظیم سکالر ابوالفضل مہندس دمشقی نجار (بڑھئی) تھے اور نجاری کے پیشہ پر انہیں فخر تھا بلکہ اس فن کے امام بھی تھے، اس لیے ان کے پاس نجاری کا کام بھی کثرت سے آیا کرتا تھا۔ بیمارستانِ کبیر شاہی شفاخانے کے اکثر دروازے ان کے ہاتھ کے بنے ہوئے تھے۔ جامع مسجد دمشق کی گھڑیاں انہوں نے درست کی تھیں اور ان کی

نگرانی کے متعلق ان کو تنخواہ ملتی تھی۔

قرآن میں حبیب نجار کا قصہ تو مشہور ہی ہے بعض صحابہؓ نے اس پیشہ کو اپنی توجہ اور دستکاری سے مشرف فرمایا۔

اب کی ملاقات میں امام سمعانیؒ نے اپنی بزم مجلس علم و فیض الانساب صفحہ ۴۶۲ میں قنادوں یعنی شکر سازوں اور شکر فروشوں کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے علماء، فضلاء اور ارباب کمال کی ملاقات کرائی ــــ قنادوں (شکر فروشوں) کی اس طویل فہرست میں سے حبیب قناد (شکر فروش) کا تذکرہ فرمایا کہ موصوف بصرہ کے رہنے والے تھے۔ بصری علماء سے علم حدیث و فقہ اور ادب و تربیت حاصل کی۔ جلیل القدر علماء اور فضلاء عصر کی زیارت و ملاقات اور ان سے تلمذ و استفادہ کے شرف سے مشرف ہو چکے تھے۔ ائمہ بصرہ کے تلمیذ خاص ہیں، حدیث کی روایت بھی ان سے کرتے ہیں۔ پھر حبیب قناد کے علوم و معارف کی حفاظت و اشاعت اور روایت کا کام ان کے جلیل القدر تلامذہ ابوایوب سجستانی نے بڑے اہتمام سے کیا۔

ابتداء میں تحصیل علم اور پھر بعد میں تدریس و اشاعت علم ان کی زندگی کا ہدف تھا یہی ان کا مقصد تھا یہی منزل تھی یہیں سے ابتداء کی اور اسی کو زندگی کی انتہاء سمجھتے تھے۔ ان کا عشق، ان کی محبت، ان کی اطاعت، ان کے جذبات، ان کا شعور، ان کا فکر اور ان کی زندگی کا ہر زاویہ علم کے محور سے وابستہ تھا۔ آج کے دور میں شاید کسی کو یہ اچنبھا معلوم ہو اور ممکن ہے کہ کوئی اسے مبالغہ پر بھی محمول کرے، مگر جناب! ہمارے تو اسلاف کی تاریخ یہی ہے۔ کس کس بات کو، تاریخ کی کون کون سی حقیقت کو اور علم حقیقت کے کون کون سے لمعات کو جھٹلاؤ گے، آنکھیں موند لاؤ گے تو کب تک؟ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کے مطالعاتی ذوق کو ان کے تذکرہ نگاروں نے مستقل بابوں میں لکھا ہے کہ ان کے علم و مطالعہ، در تحقیق و تمحیص اور رفاقت کتب کی عجیب حالت ہوا کرتی تھی، انہیں کھانے کی فکر نہیں ہوتی تھی۔ ان کی مرغوب غذا کتب بینی اور خدمت علم تھی لکھا ہے کہ امام رازیؒ کو اس بات پر تاسف ہوا کرتا تھا کہ ان کے کھانے کا وقت کیوں علمی مشاغل سے خالی

جاتا ہے اور یہ لمحات کیوں ضائع ہوتے ہیں، چنانچہ گاہے گاہے ان کی دلی کیفیات کی عکاسی ان کی زبان سے بھی ہو جایا کرتی تھی، فرمایا کرتے :۔

واللہِ انّی اتاسف فی الفوات عن اشتغال بالعلم فی وقت الاکل فان الوقت والزمان عزیز۔	اللہ کی قسم! مجھ کو کھانے کے وقت علمی مشاغل کے چھوٹ جانے پر بہت افسوس ہوتا ہے کیونکہ فرصت وقت بہت عزیز چیز ہے۔

در بزم وصال تو بہنگام تماشا
نظارہ زجنبیدن مژگاں گلہ دارد

امام رازیؒ ہوں یا ہمارے ممدوح حبیب قناد (شکر فروش) اگر اوقات کو عزیز نہ سمجھتے تو ان پر نہ علوم کے دروازے کھلتے نہ مصالح وحکم کے اسرار ظاہر ہوتے اور نہ ان کو کوئی امام کہتا۔ آج نہ رازیؒ کا تذکرہ ہوتا اور نہ صالح تجار کے تعارف کے لیے ان سطور کے لکھنے کی نوبت آتی۔

دوسرے نمبر پر امام سمعانیؒ نے طلحہ بن عمرو القناد (شکر فروش) کا تذکرہ و تعارف فرمایا ہے۔ موصوف ثقہ بزرگ، محدث اور تفسیر کے ماہر تھے۔ قرآن کی تلاوت، خدمت، تدریس اور تفسیر ان کا خاص مشغلہ تھا۔ خدمت علم و دین اور خدمتِ قرآن و تفسیر کے ساتھ ساتھ شکر سازی اور شکر فروشی کے پیشہ رزقِ حلال سے قوتِ لایموت حاصل کرتے اور زندگی گذارتے تھے۔

علم کی خدمت اور علوم نبوت کی اشاعت میں محویت کے باعث دنیا و مافیہا کے تعلقات اور متعلقات سے منقطع ہو کر رہ گئے تھے۔ اس انہماک اور علم سے وارفتگی اور عشق و محبت نے انہیں کمال بخشا کہ انتقال کے بعد بھی ان کے کمال کے چرچے ہیں۔ قنادی (شکر فروشی) کا پیشہ ان کی ذلت یا رسوائی نہیں بلکہ عزت و رفعت کا ذریعہ بنا۔ شوق اور محبت اور جذب و کیف کی حالت ان پر طاری رہتی تھی، اسی کیفیت نے انہیں علم کا اور علم کو انہی کا بنا دیا تھا تاریخ میں ایسے علمی لطیفے ہمارے اسلاف کے صحیفہ ہائے حیات میں کثرت سے ملتے ہیں کہ

محویتِ شوق اور استغراقِ علم نے انہیں پستیوں سے اٹھا اٹھا کر بلندیوں کے بامِ عروج تک پہنچا دیا۔

استغراقِ علم اور انہماکِ مطالعہ و شوقِ کتب کی مناسبت سے اسحٰق بن سلیمان طبیب کا قصہ یاد آیا، موصوف نے اس دنیا میں سو سال کی عمر پائی، ان کی کوئی اولاد نہ تھی اور نہ مدۃ العمر انہوں نے شادی کی۔ آخر عمر میں ایک مرتبہ کسی نے ان سے پوچھا کہ آپ کے دل میں اولاد کی تمنا بھی ہے؟ تو اس دانا حکیم نے جواب دیا کہ اپنی کتاب "حمیات" کے ہوتے ہوئے اولاد نہ ہونے کا کبھی خیال بھی مجھ کو نہیں آتا۔

اس کے بعد امام سمعانیؒ نے ابوالحسن علی بن عبدالرحیم قناد در عسکر فرودش کا تذکرہ فرمایا، موصوف جید عالم، فاضل، محقق اور کامیاب رہنما تھے۔ خدمتِ دین اور علم کی تدریس و اشاعت تو ان کا اولین ترجیحی شغل تھا۔ علم سے معروف، علم سے وابستہ اور علم سے متعارف تھے علم کو ان سے اور ان کو علم سے گہری نسبت قائم ہو چکی تھی۔ انہوں نے حصولِ علم کے لیے جید علماء اور اکابر اہلِ علم کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ان کے اساتذہ و مشائخ میں حسین بن منصور حلاج جیسے جلیل القدر اکابر علماء اور رجالِ علم و معرفت کے نام سرِ فہرست ہیں۔ ان کے تلامذہ میں عبداللہ بن احمد الفارسی، احمد بن ابی حاتم، ابوالعباس وغیرہ مشہور علماء اور ممتاز فضلاء کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ موصوف نہ صرف یہ کہ خود قنادی کا کام کرتے تھے بلکہ قنادی کی نسبت سے معروف تھے اور اسی لقب سے متعارف بھی تھے۔ انہوں نے دُنیا میں رہ کر دنیا کو مقصد نہیں بنایا اور نہ دنیا کے معاملات، کسبِ معاش اور وسیلہ رزقِ حلال کو لغو جان کر، دوسروں کے دستِ نگر ہونے کی ذلتیں اور رسوائیاں اختیار کیں۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اگر دنیا کا کاروبار، رزقِ حلال کی کمائی، حسبِ ضرورت کسبِ معاش لغو ہوتے تو قرآنِ حکیم میں دین کی بھلائی سے پہلے دنیا کی بھلائی کی تعلیم نہ دی جاتی اور "فی الدنیا حسنۃً" کو "وفی الآخرۃ حسنۃً" سے مؤخر کر دیا جاتا۔ اور اگر دنیا کے معاملات اور کاروبار ممنوع ہوتے اور صرف رہبانیت ہی دین ہوتا تو فقہ کی کتابوں میں صرف عبادات کے ابواب ہوتے اور معاملات کے پیچیدہ مسائل کا ذکر نہ ہوتا۔

بہرحال ہمارے موصوف قناد دُنیا میں رہے مگر دین کے ہو کر رہے، دنیا کے تعلقات نبھائے سلیقے اور خوبی کے ساتھ سب کے حقوق ادا کیے۔ ائمہ مجتہدین نے جو موشگافیاں مسائل کے معاملات میں کی ہیں، اور جو آسان راستے کاروبار کے متعلق نکالے ہیں امام ابن النجار اور ہمارے ممدوحین ارباب علم و کمال نے ان پر ہر ممکن طریقے سے بوقتِ ضرورت بھرپور عمل کیا، انہوں نے اپنے کردار و عمل سے اپنی معاملہ فہمی اور معاملاتِ دنیا میں غور کر کے نجات کا راستہ اور کامیابی اور فلاح کا منہج متعین کر دیا۔

موصوف اپنے زمانہ کے استاذ الکل کے مقام پر فائز تھے۔ اکابر اہلِ علم، علماء، فقہاء اور اساتذۂ علم ان کی عظمت کے قائل تھے اور دل سے ان کا احترام کرتے تھے۔

امام سمعانیؒ نے اس کے بعد ابراہیم بن عبدالملک قناد (شکر فروش) کا تذکرہ فرمایا جنہوں نے علمِ حدیث یحییٰ بن کثیرؒ سے حاصل کیا اور پھر خود مسندِ علم پر جلوہ افروز ہوئے تو علومِ نبوت کے پروانے شمعِ علم پر چاروں طرف سے پہنچنے لگے۔ اپنے زمانہ کی عظیم اور نادرۂ روزگار شخصیتوں نے ان کی درسگاہِ علم و فیض سے تحصیلِ علم کی سعادت حاصل کی جن میں محمد بن سلیمان المصیص زیادہ مشہور ہیں۔

جس طرح شکر کا کام شکر بنانے اور شکر فروشی میں نئے نئے طریقے نکالے اور کاروبار کی دیانت اور صنعت کی صفائی اور نکھار میں کمال کو پہنچے، اسی طرح جہالت کی تلخیوں اور بدمزگیوں کو اپنے فہم و فراست اور علم کی حلاوت سے کافور کر دیا۔ ادھر شکر سازی میں شیرینی بھر رہے ہیں اُدھر علم کی عذوبت اور حلاوت سے انسانیت کے حُسن و جمال کے علمی نقش و نگار قائم کر رہے ہیں۔

ملاقات نمبر ۱۴

چکیاں چلانے اور آٹا پیسنے والے
بعض ارباب علم وکمال

مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے ارباب علم وکمال سے متعلق ہمارے اِن مضامین کا سلسلۂ اشاعت ملک و بیرونِ ملک بڑے شوق سے پڑھا جاتا رہا۔ ماہنامہ الحق، الخیر، اقراء ڈائجسٹ اور ہفت روزہ چٹان کے علاوہ مرکزِ علم دارالعلوم دیوبند کے ماہنامہ "دارالعلوم" نے بھی ان مضامین کو بڑی اہمیت اور اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ قارئین کے خطوط بھی آتے رہے، تاثرات اور تبرکات کے نام سے نوادرات کا یہ ذخیرہ بھی علیحدہ باب کے تحت اس کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔ اور ان میں سے اکثر خطوط یا آراء اور تاثرات ماہنامہ الحق کی مختلف اشاعتوں میں شائع ہو چکے ہیں ۔ پرسوں بنگلہ دیش سے ایک صاحب کا خط آیا بڑا لمبا چوڑا، علماء سے محبت کا کرشمہ تھا یا اخلاص و محبت کی کرامت تھی، بس دردِ دل تھا جو ان کی تحریر سے چھلک رہا تھا۔ لکھتے ہیں کہ:۔

"علامہ سمعانی ؒ سے ملاقاتوں کا سلسلۂ مضامین اکابر علماء، اسلاف اور ائمہ امت اور مشاہیر ائمہ فن کی مجلسِ علمی سے کسی طرح بھی کم نہیں، جس میں مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے اربابِ علم وکمال رونق افزا ہوتے ہیں سآپ کی بزمِ تحریر، آن کے جمالِ کمال سے روشن ہوتی ہے اور ہماری نگاہیں اُن کے کمالِ جمال سے منور ایک ایسا پاکیزہ علمی وروحانی منظر نگاہوں

کے سامنے آجاتا ہے جو تاریخ میں گویا اپنی نظیر آپ ہے۔ ہماری آنکھیں جب ان علمی نشینوں کی نورانی اور قلمی صورتوں کے دیدار سے فیضیاب ہوتی ہیں تو چشمِ بصیرت میں ایک نور پیدا ہوتا ہے، ان کے احوال وکوائف اور ان کے حالات کے مطالعے کا شوق دل میں پیدا ہوتا ہے، خدا کا شکر ہے کہ آپ کی جدید طرزِ تحریر سے ہمیں اپنے متقدمین علماءِ راسخین اور سلف صالحین کے ساتھ معنوی ہمنشینی نصیب ہو جاتی ہے۔"

مجھے طبعی طور پر ایسے خطوط سے تقویت پہنچتی ہے، ہمت افزائی ہوتی ہے اور ساتھ ساتھ یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ الحمد للہ کہ اب کے دور میں بھی، اس گئے گذرے پُر فتن اور مادیت کے دور میں بھی علم کا ذوق اور سلف صالحین کے تذکروں سے استفادہ اور موانست کا شوق ابھی زندہ ہے۔ گو کہ اجتماعی اور قومی اعتبار سے یا موجودہ نظامِ تعلیم اور معاشرتی اعتبار سے خزاں نے ہم سے علمِ دین اور اسلامی تاریخ سے شغف کی بہاریں لوٹ لی ہیں ؎

خزاں رسید وگلستاں بآں جمال نماند
سماعِ بُلبل شوریدہ رفت وحال نماند
نشانِ لالۂ ایں باغ از کہ می پُرسی
برو کہ آنچہ تو دیدی بجز خیال نماند

مسلمانوں کا ایک دور تھا جب علمِ دین ان کی پہلی اور آخری خواہش ہوا کرتی تھی وہ اگر زندگی بسر کرتے تو علم کے لیے، کماتے اور کھاتے تو علم کے لیے، لڑتے اور جہاد کرتے تو علم کے لیے، ان کی دوستی اور دشمنی کا معیار علم تھا، ان کے تعلق اور محبت و نفرت کا محور علم تھا، ان کی حیات وممات علم پر ہوتی تھی، یہی ان کا امتیاز تھا، یہی ان کی عزت وذلت کا نشان اور یہی ان کے فخر ومباہات کا سامان تھا۔

ان کی علمی حمیت بڑی تیز اور حساس تھی جس کو جوش میں لانے کے لیے ایک چھوٹی اور ادنیٰ سی تحریک بھی کافی ہو جایا کرتی تھی۔ لکھا ہے کہ فنِ ادب کے مشہور امام کسائی ہمیشہ مجلسِ علماء میں جایا کرتے تھے۔ ایک روز حسبِ معمول جب مجلسِ علم میں پہنچے تو راستے

کی طوالت اور صعوبت سے تھک چکے تھے، حالت خستہ تھی، چہرے پر اس کے آثار ہویدا تھے۔ اپنی طبعی شکستگی اور خستگی ظاہر کرنے کے لیے انہوں نے اہلِ مجلس کے دریافت کرنے پر جواب میں فرمایا "عیّیت" (بالتشدید) یعنی میں تھک گیا ہوں۔ مجلس علم وادب کی تھی، ذوقِ سلیم پر ان کا یہ لفظ گراں گذرا اور مجلس میں بعض اہلِ علم نے امام کسائیؒ کو اس فحش غلطی پر ٹوکا اور کہا کہ تم غلط لفظ استعمال کر رہے ہو۔ امام کسائیؒ نے وجہ دریافت کی تو توانہوں نے کہا اگر تمہاری مراد ماندگی ہے تو "اعییت" کہنا چاہیے اور اگر درماندگی کا اظہار مقصود ہے تو "عییت" بالتخفیف کہنا چاہیے ــــــ امام کسائیؒ کے دل میں اہل علم کی بھری مجلس میں اس اعتراض اور تخفیف نے زخم پیدا کر دیا، چوٹ لگی اور ایسی کہ فوراً اس مجلس سے اٹھے اور باہر نکل آئے، دل میں یہ تہیہ اور عزم مصمم کر لیا کہ اب اس فن کو بتمامہ وکمالہ اس طرح سیکھنا چاہیئے کہ پھر زندگی بھر آئندہ ایسی خفت کسی بھی محفل میں نہ اٹھانی پڑے۔ چنانچہ اس عزم کے بعد اس فن کے ائمہ اور مشہور اساتذہ کی تلاش شروع ہوئی۔ خلیل بصریؒ کی کسی نے نشاندہی کی تو اُسی وقت رختِ سفر باندھا اور فنِ ادب کے استاذِ یگانہ خلیل بصریؒ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور اُن سے التزام اور بڑے انہماک کے ساتھ عربی ادب کی تحصیل کرنے لگے، مگر جوہرِ رتبہ اور مقامِ امامت امام کسائیؒ کو اس فن میں ملنے والا تھا اس کے لیے صرف خلیل بصریؒ کی مجلسِ علم اور درسگاہِ فیض کافی نہیں تھی۔

اسی زمانہ میں امام کسائیؒ جب ایک روز کسی گلی سے گذر رہے تھے تو ایک بدوی نے ان پر یہ طعن کیا کہ تم لوگ کانِ ادب، بنو تمیم اور بنو اسد کو چھوڑ کر عربیت حاصل کرنے بصرے آئے ہو، بھلا یہاں کتنا ادب حاصل کر سکو گے؟ یہ چبھتا ہوا فقرہ امام کسائیؒ کے دل میں اتر گیا اور اپنے استاذ علامہ خلیل بصریؒ سے کسی موقعہ پر انہوں نے دریافت کیا حضرت! آپ نے فنِ ادب کہاں سے سیکھا؟ استاذ نے جواب دیا حجاز، تہامہ اور نجد کے جنگلوں میں، بس پھر کیا ہوا، کسائیؒ کے سر میں ایک تازہ سودا پیدا ہوا، عشق کی موجیں مچلنے لگیں، شہر چھوڑ دیا، صحراؤں اور جنگلوں کی راہ لی، قبیلہ در قبیلہ پھرتے رہے اور اتنے پھرے اور اس قدر اسفار کیے کہ فنِ ادب کا کوئی پہلو ان سے پوشیدہ نہ رہا حتیٰ کہ

اس فن کے امام بن گئے جس کے نہ جاننے سے شرمندہ ہونا پڑتا تھا آج اس کے ایک ایک پہلو سے انہیں عزتیں اور رفعتیں مل رہی ہیں۔

یہ کیا؟ علم نے لکڑہاروں کو، بڑھئیوں کو، حلوائیوں کو، لوہاروں اور موچیوں کو، غلاموں اور مزدوروں کو وہ مقام اور ایسی عظمتیں بخشیں کہ جاہ و منصب اور اقتدار کی رنگینیوں سے ان کا کروڑواں حصہ بھی نہیں خریدا جاسکتا۔ علم نے کمیوں اور پیشہ وروں کو عظمتوں کے جو مقام بخشے اس کی جھلکیاں گذشتہ تحریروں میں آپ دیکھتے چلے آئے ہیں۔ لیجئے آج بھی امام سمعانیؒ کی مجلسِ علم و معرفت میں حاضری دیتے ہیں کہ مزید نورِ علم اور بہارِ عرفان حاصل ہو۔

آج محرم الحرام ۱۴۰۹ھ کی گیارہ اور اگست ۱۹۸۸ء کی پچیسویں تاریخ ہے۔ علامہ سمعانی کی الانساب حسبِ معمول زیرِ مطالعہ ہے اور صفحہ ۳۶۸ میرے سامنے ہے، استفادہ و مطالعہ یا افادہ اور گفتگو کا عنوان طحان ہے ___ طحان عربی کا لفظ ہے، آٹا پیسنے اور آٹا بیچنے والے کو کہتے ہیں۔ ان کے یہاں آٹا کی پسائی کے لیے چکی، پن چکی اور ہوائی چکی ہوا کرتی تھی۔ یہی ان کا ذریعۂ معاش، یہی ان کا وسیلۂ رزقِ حلال ہوا کرتا تھا۔ امام سمعانیؒ کے آج کے ارشاداتِ روحانی اور الانساب کی فہرست میں جن طحانوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ کوئی عام کاروباری لوگ نہیں تھے نہ ان کا مقصدِ حیات فقط کمانا اور کھانا یا سرمایہ بنانا تھا، یہ تو علماء، فقہاء، محدثین اور ائمہ علم و فن کی جماعت تھی جنہوں نے خدمتِ دین کی راہ میں خود کو وقف کر دیا تھا، چکیاں چلاتے تھے اور اس سے خدمتِ علم اور اشاعتِ علم کے پیشِ نظر زندگی کے بقاء و تحفظ کے لیے رزقِ حلال کماتے تھے۔

آپ مسلم طحانوں کی فہرست پڑھ ڈالیے آپ کو حیرت ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے اس طبقہ میں کیسے کیسے نادرۂ روزگار علمی اور دینی شخصیتیں پیدا فرمائی تھیں اور انہیں کیسے کیسے علمی و دینی مناصب اور مقامات و درجات سے نوازا تھا۔

امام سمعانیؒ نے ارشاد فرمایا کہ طحانوں کے اربابِ علم و کمال میں ابو موسیٰ حبیب بن صالح کو جو مقام اور انفرادیت اور علمی و دینی طبقوں میں جو خصوصی امتیاز اور سیاسی فوقیت و برتری حاصل تھی وہ ان کے زمانے میں کسی دوسرے کو کم نصیب ہوئی۔ موصوف

ملک شام کے ممتاز علماء میں تھے۔ ان کے اساتذہ میں زید بن شریح کا نام زیادہ مشہور ہے۔ دنیا کی رنگینیاں، اقتدار کی رونقیں، سرمایہ کی بہاریں اور جاہ و منصب کی مصنوعی اور عارضی روشنیاں ان کی دور بین اور علم پرور نگاہوں کو خیرہ نہ کر سکیں۔ انہوں نے طلب علم کے زمانہ سے اپنا دل و دماغ، اپنا فکر و تصور، اپنا جوش و ہوش اور اپنی بقا و حیات کو علم کے سانچوں میں اس طرح ڈھال دیا تھا اور اس میں اس قدر پختگی اور استقامت پیدا کر لی تھی کہ پھر زندگی بھر کسی دوسری جانب نگاہ بھی نہ اٹھ سکی۔ علم کی چاشنی، علم دین کی لذتیں اور اس کی بہاریں واقعۃً اتنی ہی دلآویز ہیں کہ قلم کی زبان اور ادب کا بیان اس کی واقعاتی عکاسی سے قاصر ہے۔ بطور مثال ایک واقعہ عرض کیے دیتا ہوں: —— لکھا ہے ابو بکر بن بشارؒ جو ادب کے مشہور امام ہیں، علم و فن کے آفتاب ہیں، بغداد میں شہزادوں کے اتالیق تھے ایک روز شہزادوں کو پڑھانے کے لیے قصرِ خلافت جا رہے تھے، راستہ میں نخاس پر سے ان کا گذر ہوا، وہاں ان دنوں ایک جاریہ (لونڈی) آئی ہوئی تھی جس کے حسن و جمال اور سلیقہ و کمال کا سارے بغداد میں چرچا تھا، ابن بشارؒ کی اس پر اتفاقی نظر پڑی، انسان اوّل و آخر انسان ہی ہے طبعی اور بشری تقاضے سے کون ہے جو چھٹکارا حاصل کر سکے، بے چارے مغلوب ہو گئے اور اس لونڈی پر مفتون ہو گئے، دل دے بیٹھے، جیسے تیسے بہ ناخاستگی دار الخلافہ پہنچ گئے تو خلیفہ نے ان سے پوچھا جناب! آج ہمیشہ کے معمول سے دیر سے کیوں پہنچے، ہوا؟ خیریت تو تھی؟ ابن بشارؒ دل کے کھرے آدمی تھے اور یہ وہ زمانہ تھا جب اہلِ علم صحیح معنوں میں اہلِ علم ہی تھے۔ دروغ گوئی، ملمع سازی، مکر و فریب کی سیاست بازی کی بیماریاں اور وبائیں کم پھیلی تھیں۔ ابن بشارؒ نے جو دل میں تھا اور جو پیش آیا بلا کم و کاست صاف صاف بیان کر دیا اور جاریہ (لونڈی) کے ساتھ اپنی قلبی واردات کے ماجرا کی روئیداد سنا ڈالی، خلیفہ نے سنا تو درپردہ (کہ ابن بشارؒ کو علم نہ ہونے پائے) اپنے خدام کو حکم دیا کہ وہی جاریہ (لونڈی) جس کا ذکر ابن بشارؒ نے کیا ہے ہماری طرف سے اس کو اپنی مطلوبہ قیمت پر خرید کر ابن بشارؒ کے مکان پر پہنچا دیا جائے مگر اس بات کا خیال رہے کہ ابن بشارؒ ابھی گھر نہ پہنچے ہوں کہ جاریہ (لونڈی) پہلے وہیں موجود ہو۔ شاہی حکم

تھا کس کو اس میں تاخیر اور تامل کی گنجائش ہو سکتی تھی۔ چنانچہ شاہی خدام نے فوراً بلا تاخیر اس جاریہ (لونڈی) کو علامہ ممدوح ابن بشارؒ کے گھر پہنچا دیا۔ موصوف جب شہزادگان کو پڑھانے سے فارغ ہو کر واپس اپنے مکان پر تشریف لائے تو یہاں اس جاریہ (لونڈی) کو موجود پایا، وجہ دریافت کی تو انہیں بتایا گیا کہ خلیفۂ وقت کی طرف سے بطور تحفہ یا ہدیہ یہ تمہاری خدمت میں بھیجدی گئی ہے۔ اول وہلہ میں تو خوش ہو گئے اور اس لونڈی کو بالاخانے پر بھیجدیا خود وہیں نیچے کے کمرے میں بیٹھ کر ایک علمی مسئلہ پر غور کرنے لگے جس کی تحقیق و تمحیص میں وہ ان دنوں مصروف تھے، کتابیں بکھری پڑی تھیں، حوالہ جات اور متعلقات کی تلاش جاری تھی، فکر و تدبر سے کام لیا جا رہا تھا، طبیعت اور مزاج پر علم غالب تھا اور اب طبیعت علم کی محبوبہ کے حسن و جمال پر اس قدر مفتوں ہو چکی تھی کہ انہیں اس جاریہ (لونڈی) کا خیال تک نہ رہا اور پھر قلب میں ترحم کا جذبہ تھا کہ بے چاری ہمارے انتظار میں بیٹھے سوکھ جائے گی اور علم کی رفیقہ و محبوبہ سے افتراق تو ممکن ہی نہیں، اس لیے فیصلہ کر لیا کہ جاریہ کو واپس بھیجدیا جائے، چنانچہ اپنی قلبی کیفیت کا یہ حال دیکھ کر ابن بشارؒ نے خادم کو بلایا اور کہا کہ اس شہرِ آشوب کو لے جا کر نخاس میں واپس کرا آؤ کہ میرے دل میں اس کی اتنی اہمیت، وقعت اور ترجیح و محبت نہیں ہے کہ میں محبوبۂ علم سے چند لمحے فراق کے برداشت کر کے اس کے ساتھ مصروف ہو جاؤں' لہٰذا اسے واپس کرا آؤ۔ چنانچہ خادم نے جاریہ (لونڈی) کو واپس کر دیا اور موصوف اپنے علم کے ہو رہے۔

جبیب بن صالح طحان بھی اسی زمرہ کے لوگوں سے تھے۔ انہوں نے بھی بادشاہوں کے تحفوں، سرمایہ داروں کے نذرانوں اور دنیاداروں کے شکرانوں پر طحانوں کے عملِ رزقِ حلال کو ترجیح دی۔ چکی چلاتے، آٹا پیستے اور اپنے خون پسینہ کی محنت سے جو کمائی حاصل کرتے اس سے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتے اور وہ بھی بقدر کفاف، باقی سارا وقت ان کا علم کی خدمت میں گذرتا، ان کی علمی عظمت اور رتبہ و مقام اور عظمتِ شان کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جریر بن عثمانؒ اور ابو ہیثمؒ جیسے اکابر علماء نے ان سے استفادہ کیا اور ان سے تلمذ کو اپنے لیے فخر و امتیاز سمجھا۔

امام سمعانیؒ نے اس موقع پر خالد بن عبداللہ طحان واسطیؒ کا طویل تذکرہ فرمایا، بڑے مزے لے لے کر ان کی داستانِ علم و معرفت سناتے رہے، وہ چاہتے تھے کہ اپنی قلبی کیفیات، دلی جذبات، علمی اہمیت کے ان واقعات کو جس طرح بن پڑے سامعین و ناظرین کے قلوب میں انڈیل دیں اور یہی ہمارے اسلاف کا بھی معمول تھا۔

خالد طحانؒ نے بھی رزقِ حلال کے کمانے اور قوتِ لایموت حاصل کرنے کے لیے چکی چلانے کا پیشہ اختیار کیا، آٹا پیستے اور مزدوری کماتے۔ آٹا پینے اور چکی چلانے کے ساتھ ساتھ علم و فن کی مشق میں بھی عجیب عجیب کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، واقعی ان کی طبیعت یک طرفہ تماشہ تھی، ان کے علم و فضل کی چکیوں نے وہ فیضانِ عام جاری کیا ہے کہ بے شمار روحوں کو ان سے غذا ملی اور جسدِ ملت میں ان کی علمی اور روحانی غذا سے زبردست اور انقلابی سطح پر تاب و تواں آئی، انھوں نے طلبِ علم سے کسی وقت بھی چھٹی نہیں کی، وہ فراغت کے ہر لمحے کو غنیمت سمجھتے تھے۔ خالد طحان ہوں یا طحانوں کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے دیگر اکابر علم و فضل یا ہمارے ائمہ امت و علماء اسلاف، انہوں نے میدانِ علم میں بزدلی سے اجتناب کیا اور جوانمردی کے ایسے انمٹ نقوش ثبت کیے ہیں کہ قیامت تک زندہ و جاوید بن گئے۔

علامہ ابن العلاء سے ایک مرتبہ کسی نے پوچھا تھا جناب! علم کب تک حاصل کرنا چاہیئے؟ تو اس عالی دماغ نے جواب میں فرمایا:۔

مادامت الحیوۃ تحسن بہ | یعنی جب تک زندگی مہربان رہے۔

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ دریائے علم ناپیدا کنار ہے اور انسانی زندگی محدود، بایں ہمہ اگر ایک آدمی ایک حد پر پہنچکر علم سے سیر ہو جائے تو یہ اس کی حرماں نصیبی ہے، شوق کا اور سچے جذبۂ تحصیل کا تقاضا تو یہ ہے کہ ؎

دست از طلب نہ دارم تا کام من بر آید
یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید

خالد طحان ہوں یا جبیب طحان، دونوں نے اس قول کو دمِ واپسیں تک عزیز رکھا

اور یہ مسئلہ تو سب مانتے ہیں اور یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ عالم میں کسی حالت کو ثبات نہیں ہے یا ترقی ہے یا تنزل۔ پس علمی عروج وارتقاء میں بھی جس زینے پر طالب کا قدم رکا وہیں اس کا تنزل اور انحطاط شروع ہو جائے گا۔ جب تک طالب علم کے ذہن میں اپنی نادانی کا خیال راسخ اور مادامت الحیٰوۃ تحسن بہ پیشِ نظر رہے گا تو اس کو میدانِ طلبِ علم میں فتح اور فیروزی نصیب ہوتی چلی جائے گی۔

علمی بلندیوں، علمی مراتب و درجات اور علم کے رفیع مقامات پر فائز ہونے کو تو سب کا جی چاہتا ہے مگر اس منزل کی جو راہ ہے اس پر وہی آتے اور چلتے ہیں جو طلبِ علم میں اور اپنے دعاوی میں مخلص ہوتے ہیں، علم سے سیری نہیں جتنا زیادہ حاصل کرو اتنی زیادہ پیاس لگے گی۔ دیارِ مغرب کا ایک حکیم دانا جب بستر نزع پر دم توڑ رہا تھا تو اس نے کہا کہ دنیا میرے علم کی نسبت معلوم نہیں کیا کیا گمان کر رہی ہے مگر میں اپنے آپ کو یہ سمجھتا ہوں کہ ایک نافہم بچہ سمندر کے کنارے پر چند خذف پاروں سے کھیل رہا ہے اور علم کا ناپیدا کنار سمندر اس کے سامنے موجزن ہے۔

خالد طحان نے حصولِ علم اور تحصیلِ ادب میں صرف ایک استاذ یا ایک شیخ پر اکتفا نہیں کیا، انہوں نے حمید الطویل، ابو عثمان اصبحی، عراک بن مالک، مشکان بن ابو عمر اور راشد بن سعد جیسے اساتذۂ علم اور اربابِ فضل و کمال کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور ان کے علوم و معارف کو اپنے سینہ اور سفینہ میں ضبط و محفوظ کر کے پورے عالم میں پھیلانے کی سعادتمندیوں سے سرفراز ہوئے۔ کیا فارغ البالی سے؟ کیا ان کے علائق دنیوی اور ضروریات وحاجات نہیں تھے؟ ایسا نہیں! اور عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے اس دور کے لوگ جب پچھلوں کے شاہکار، علمی کارنامے، کئی کئی مجلدات پر مشتمل بڑی بڑی تصانیف دیکھتے ہیں تو اگلے زمانے کو ایک بہشتی زمانہ تصور کرنے لگتے ہیں اور خیال کرنے لگتے ہیں کہ اگلے زمانوں میں علماء کے واسطے در و دیوار اور زمین و آسمان سے اطمینان اور فارغ البالی برستی تھی اور ہمارے زمانے کے لوگوں کا عام خیال و گمان ہے بلکہ بدگمانی ہے کہ جو کارہائے نمایاں ہمارے اسلاف، ائمہ علم اور متقدمین اور سلفِ صالحین نے کیے ہیں وہ اسی فارغ البالی اور فراغ خاطر کی بدولت

تھے، حالانکہ تاریخ کے قطعی مسلمات اور سچے واقعات اس کی تردید کرتے ہیں۔ اگر یقین نہ آئے تو شیخ الرئیس کی زندگی کی ایک جھلک دیکھتے چلے جائیے:۔

شیخ الرئیس سے ایک زمانے میں حکام وقت ناراض تھے اور ہمہ دم برہم رہتے تھے، اس نے جان کے خوف سے خود کو روپوش کر رکھا تھا۔ اسی تباہ حالی میں کچھ دن کیلئے شیخ الرئیس کو ایک عطار کے گھر میں پناہ مل گئی، اتنا سا اطمینان پاکر شیخ الرئیس کو اپنے علمی مشاغل یاد آ گئے۔ انسان جب کسی پریشانی میں مبتلا ہوتا ہے تو اس سے معمولی کام بھی نہیں ہو سکتے، لیکن طلبِ صادق میں یہ کرامت ہے کہ وہ پریشانی کو بھی جمعیت اور اطمینانِ خاطر کے قالب میں ڈھال دیتی ہے۔ ہمارے ممدوحین طلبان ہوں یا علماء سلف، انہوں نے پریشان خاطری کی حالت میں بھی وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں کہ زمانہ آج تک ان پر آفرین کہہ رہا ہے۔

بہرحال شیخ الرئیس نے عطار کے گھر میں روپوشی اور زمانۂ پناہ کو غنیمت جانا اور ان سے سامانِ تحریر منگوا کر تصنیف شروع کر دی، یہ کوئی معمولی کتابچہ، کوئی نجی کا خط اور کوئی عام تصنیف نہیں تھی بلکہ شیخ اپنی کتاب "شفاء" کو مکمل کر رہے تھے، طرزِ تحریر یا اندازِ تصنیف یہ تھا کہ اول رؤس مسائل اپنی یاد سے ایک جزء پر لکھتے اس کے بعد ان مسائل کی تشریح کرتے، اس طرح فنِ طبعیات والٰہیات کو مکمل کر لیا۔ فنون حکمیہ، کتاب حیوان اور کتاب نبات اگرچہ باقی تھیں لیکن شیخ نے ان کو چھوڑ دیا اور فنِ منطق میں لکھنا شروع کر دیا، ہنوز منطق لکھی جا رہی تھی کہ قضیہ دگرگوں ہو گیا، کسی ظالم مخبر نے حکمرانوں کو خبر کر دی اور شیخ عطار کے گھر سے گرفتار ہو کر قلعہ فردخان میں بھیجدیئے گئے۔

مگر اب آگے کی تفصیل سنیئے! علم کی تحصیل یا تصنیف کی تکمیل جو عنوان بھی دیں، بہرحال ہے دلچسپ اور سبق آموز ——— اس بلند و استوار حصار میں شیخ الرئیس کا جسم مقید تھا لیکن ان کے علمی شوق اور مطالعاتی اور تصنیفی ذوق کو دنیا کی کوئی طاقت مقید نہیں کر سکتی تھی، اس زندان میں اپنا علمی اور تصنیفی کام جاری رکھا اور معرکۃ الآراء مشہور عالم شاہکار کتب "کتاب الہدایات"، رسالہ حی بن یقظان اور کتاب القولنج تصنیف کر ڈالیں۔

اس واقعہ کو ہم نے خوفِ طوالت سے مختصر طور پر نقل کر دیا ہے۔ کیا اس واقعہ کے پڑھنے

کے بعد کسی کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوگی کہ کاش! اس کو شیخ الرئیس کا سا اطمینان نصیب ہوجاتا اگر شیخ الرئیس نجات، آزادی، بڑے کتب خانے، وسائل کی کثرت اور فراغ خاطر کا انتظار کرتے تو دنیا کو ان کی گرانقدر کتب اور "شفا" وغیرہ جیسی بیش بہا تصانیف کب میسر آسکتی تھیں۔

بہرحال بات خالد طحان کی ہورہی تھیں، ان کا بھی خاندان تھا، بچے تھے، عزیز و اقارب تھے، انسان تھے اور انسانی حاجات کی تکمیل کی ان کو بھی ضرورت تھی۔ فارغ البالی اور اطمینانِ خاطر انہیں کب حاصل تھا، اِن ساری ذمہ داریوں کو پورا کرتے تھے، معاش اور معیشت کی ضرورت کے پیشِ نظر آٹا پیسنے اور چکی چلانے کی مزدوری کرتے تھے مگر علمی ذوق اور مطالعاتی شوق میں یہ چیزیں ان کے لیے رکاوٹ نہیں بن سکتی تھیں علمی تشنگی ہو اور طلب صادق تو پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہوجاتے ہیں اور استغراق و انہماک ایسا نصیب ہوتا ہے کہ موت بھی خوش نصیبوں کو کتابوں کے اوراق پر اپنے آغوش میں لے لیتی ہے۔

امام ادب ابوالعباس ثعلبؒ کا واقعہ اور دلچسپ قصہ اس کی ایک مؤثر مثال بن سکتا ہے، لکھا ہے کہ امام ثعلبؒ کی عمر اکانوے برس کی ہوچکی تھی، ایک روز جمعہ کی نماز کے بعد مسجد سے مکان کو جانے لگے، راستے میں کتاب دیکھتے جاتے تھے، کتاب میں محویت، استغراق اور انہماک کا یہ عالم تھا کہ سماعت نے بھی کام چھوڑ دیا تھا، وہ کتاب کے نقوش کی خاموش مگر مؤثر آواز کے پیشِ نظر باہر کی دوسری آوازوں سے بہرے ہوگئے تھے۔ اتفاق سے سامنے سے آتے ہوئے یا پیچھے سے آتے ہوئے ایک گھوڑے کا دھکا لگا اور اس کی چوٹ سے بے ہوش ہوکر زمین پر گر پڑے، لوگ غشی کی حالت میں اٹھا کر مکان پر لائے، ضعف، پیری اتنے بڑے صدمے کو کب برداشت کرسکتی تھی، اسی حالت میں رحلت کی ——— آپ اندازہ لگائیں کہ انتہائے پیری میں بھی ان کا شوقِ طلب اتنا قوی تھا کہ راہ نوردی میں بھی جو وقت گذرتا اس کا جاتا رہنا بھی گوارا نہ ہوا۔

اور یہ تو میرے اپنے کانوں کی سنی بات ہے۔ محدثِ کبیر استاذ العلماء شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب دامت برکاتہم جن کو اللہ تعالے نے ایک عالم کا مقتداء بنایا جہاں افغانستان

میں آپ کے تلامذہ آجکل کابل، قندھار کی فوجی چھاؤنیوں میں روسی دشمنوں سے برسرِ پیکار ہیں، جنہیں ۱۹۸۵ء کی تحریک نفاذِ شریعت میں ۲۲ دینی تنظیموں نے شریعت محاذ کا صدر منتخب کیا اور مانسہرہ ضلع ہزارہ میں تین ہزار سے زائد علماء نے سوشلزم اور باطل قوتوں کے مقابلہ میں ان کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کی اور متفقہ طور پر "قائدِ شریعت" کے خطاب سے نوازا، پھر اس صدا کی بازگشت پورے ملک میں پھیل گئی۔ بنوں میں ۵ ہزار سے زائد علماء نے آپ کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کی، مردان اور پشاور میں بھی سرحد بھر کے علماء جمع ہوئے اور بیعتِ جہاد کی، ادھر دارالعلوم حقانیہ کی ذمہ داریاں اس پر مستزاد، اہتمام و انتظام کے بکھیڑوں سے انہیں کب فرصت ملتی تھی مگر مطالعہ اور رفاقتِ کتب ان کی فطرت اور طبیعتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ بعد العصر کی ایک مجلس میں ارشاد فرمایا: جب آنکھیں کام کرتی تھیں اور بینائی درست تھی تو ایک لمحہ بھی مطالعہ کے بغیر نہیں گذرتا تھا اور اب جب نظر کمزور ہو گئی ہے تو ایک ایک لفظ کے لیے ترستا ہوں اور ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتا ہوں۔

بتانا دراصل یہ ہے کہ حضرتِ اقدس اپنے زمانۂ صحت مگر بڑھاپے و ضعف کی حالت میں بھی جب گھر سے دارالعلوم آتے تو عام اور معروف راستوں سے ہٹ کر مختصر راستہ سے دارالعلوم تشریف لاتے، اس راستہ میں بڑی بڑی کھڈیں تھیں، دونوں طرف گڑھے ہوتے اور بیچ میں قدم رکھنے کی باریک پگڈنڈی، حضرت اقدس مدظلہ کی نگاہوں کے سامنے کتاب ہوتی نگاہیں حواشی اور متن کے الفاظ پر مرکوز ہوتیں قدم اپنا کام کرتے، دیکھنے والے لوگ خیر و عافیت کی دعائیں مانگتے کہ ان راستوں پر محتاط چلنے والوں کو بھی پاؤں کی لغزش اور لرزش کیکپا دیا کرتی تھی۔

بہر حال علمی تشنگی اور ذوقِ طلب کا اخلاص نہ ہوتا تو آج مولانا عبدالحق مدظلہ نہ شیخ الحدیث بنتے نہ قائدِ شریعت کا مقام پاتے، اور نہ ابوالعباس ادب میں امامت کے درجہ کو پہنچتے۔

بات خالد طحان کی ہو رہی تھی، ان کی محنت و مطالعہ، ذوقِ علم اور تعب و مشقت کے پیشِ نظر خدا نے علمی کمالات سے نوازا اور طلبہ علمِ دین کے مرجع بن گئے پھر ان کا فیض ملکوں ملکوں پھیلا۔ قتیبہ بن سعیدؒ، عمرو بن عونؒ، سعید بن منصور خراسانیؒ صاحب السنن اور سعید بن سلیمانؒ آپکے

مشاہیر تلامذہ میں سے ہیں۔

امام سمعانیؒ نے فرمایا کہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ فرمایا کرتے تھے کہ خالد طحان نہایت ثقہ اور دینداری میں صالح اور نیک آدمی تھے اور مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے تین بار (یا اس سے زائد) اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ فروخت کیا ہے۔ ہمارے نزدیک خالد طحان ہیثم سے زیادہ مجرب و معتمد ہیں، ۱۷۹ھ یا ۱۸۲ھ میں وفات پائی۔

اس کے بعد امام سمعانیؒ نے رستم طحانؒ اور ابو نعیم طحانؒ کا دلچسپ تذکرہ کیا ہے مگر بخوف تطویل اور قارئین کی اکتاہٹ کے پیش نظر ہم اسے ضبط تحریر میں نہیں لا رہے آج کی مجلس بڑی دلچسپ رہی۔ خدا تعالیٰ ہمارے محبوب و مہربان حضرت سمعانیؒ کو کروٹ کروٹ رحمتوں سے نوازے کہ انہوں نے علم کی راہ بتلائی ہے اور ایک پیارے اور دلچسپ موضوع سے رشتہ و تعلق استوار کرنے کا موقع مرحمت فرمایا ہے۔

ملاقات نمبر ۱۵

صابون سازوں، شیشہ گروں اور شکاریوں کے طبقے سے تعلق رکھنے والے اربابِ فضل و کمال

امام سمعانیؒ سے تیسرا روز ہے مسلسل استفادہ ہو رہا ہے، خدا کا فضل ہے کہ استقامت سے مطالعاتی صورت میں ان سے حصولِ فیض اور اس کے ضبط و تحریر میں دسیوں دیگر مشاغل اور ضروریات کے باوجود انقطاع یا اکتاہٹ کا تصور تک نہ اُبھر سکا۔ تجاریوں یعنی بڑھیوں اور طحانوں یعنی آٹا پیسنے والوں کا تذکرہ حسن و جمال، طلبِ علم و کمال اور پیشۂ رزقِ حلال، دسیوں بیسیوں نہیں بلکہ سینکڑوں کی ہدایت و رہنمائی اور فلاح و کامیابی اور باعزت اور باخدا زندگی گذارنے کا اُسوہ اور نمونۂ عمل ثابت ہوگا۔

اب کے بار جب مطالعاتی حاضری کی سعادت حاصل ہوئی تو موصوف نے الانساب کا صفحہ نمبر ۳۴۶ اور نمبر ۳۴۷ کھول کر سامنے رکھ دیا۔ پیشہ سُرخی یا افادات اور گفتگو کا عنوان صابونی قرار پایا۔ امام سمعانیؒ نے اس لفظ کے معنی اور مفہوم کی توضیح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

هذه النسبة الى عمل الصابون۔	صابونی کی نسبت صابون بنانے کا کام کرنے والوں کی طرف ہے۔

صابونی نسبت سے وہ علماء اسلام اور ائمہ امت اور رجالِ علم مشہور اور متعارف ہیں جو صابون سازی اور صابون فروشی کا کام کرتے تھے اربابِ علم و کمال تو تھے ہی صابون سازی کا کام کر کے رزقِ حلال بھی کما لیتے تھے۔ یا انہیں صابونی اس لیے بھی کہتے ہیں کہ انکے آباؤ اجداد

اس پیشہ سے حلال روزی کماتے تھے ۔

امام سمعانیؒ نے اس طبقۂ علم کے ارباب باکمال کے تعارف میں سرفہرست ابو عثمان اسمٰعیل بن عبدالرحمٰن صابونیؒ کا تذکرہ فرمایا جو اپنے زمانے میں علماء امصار اور مسلمین کے دیار میں "شیخ الاسلام" کے لقب سے مشہور تھے ۔ موصوف بہت بڑے مفسر، علوم قرآن کے جید فاضل، محدث، خوش بیان اور مؤثر واعظ اور لاجواب خطیب تھے ۔ ساٹھ سال تک اپنی تبلیغ ونصیحت اور مواعظ وخطابت سے عامۃ المسلمین کو ہدایت کی ۔ لکھا ہے کہ فنِ خطابت میں یکتائے روزگار تھے اور اس فن میں کوئی ان کا ہمسر نہیں تھا، بیس سال تک نیشاپور کے منبر پر خطابت کی ۔ ان کی عظمت، تبلیغی سرگرمیاں اور عامۃ الناس میں اثر ورسوخ کی وجہ یہ تھی کہ انہیں علم پر کامل عبور تھا ۔ زمانہ کے حالات پر مضبوط گرفت تھی، از ماطالبعلمی میں انہوں نے علم کے ساتھ قلبی شغف اور انہماک اتنا بڑھا لیا تھا کہ دنیوی معاملات اور حالات اور بعض اوقات طبعی میلانات میں ان کے پائے استقامت اور ذوقِ طلب علم میں کوئی مخالف لہر بھی نہ پیدا کر سکے، یہ ایک مستقل موضوع ہے کہ ائمہ اسلاف نے کردار وعمل کے نقشہ میں اسی کا رنگ بھرا ہے ۔ ایک امام ابو عثمان صابونیؒ کیا؟ تاریخ اٹھا کر دیکھئے تحصیلِ علم وکمال میں ایک سے ایک بڑھ کر ہے، اس چمن کا ہر پھول اپنی مہک اور حسن وجمال میں دوسرے سے بڑھ کر ہے سے

ہر گُل را رنگ وبوئے دیگر است

علامہ یحییٰ بن یحییٰ مصمودیؒ جو حدیث کی معروف کتاب "مؤطا" کے ناقل ہیں اور امام مالکؒ کے خصوصی تلمیذ اور صاحب سر ہیں، ایک روز حضرت امام مالکؒ کے درس میں حاضر تھے اور علمِ حدیث کا استفادہ کر رہے تھے، ان کے علاوہ مستفیدین اور طلبہ علمِ دین کی ایک بڑی تعداد بھی شریکِ درس تھی جو امام مالکؒ کی خدمتِ فیض ورحمت میں بہرہ یاب ہو کر فیضیاب ہو رہی تھی کہ دفعتہً ہاتھی کے آنے کا شور وغل ہوا چونکہ ملک عرب میں ہاتھی کو نہایت تعجب کے ساتھ دیکھا جاتا تھا اس لیے بعض عرب کے رہنے والے ہاتھی کے دیکھنے کو فخریہ بیان کر کے مبارکبادی کے خواستگار ہوتے ہیں جیسا کہ ابو الشمق

کے اِن دو شعروں سے ظاہر ہوتا ہے ؎

(۱) یَا قَوْمِ اِنِّیْ رَاَیْتُ الْفِیْلَ بَعْدَکُمْ
فَبَارَکَ اللّٰہُ لِیْ فِیْ رُؤْیَۃِ الْفِیْلِ

(۲) رَاَیْتُہٗ وَلَہٗ شَیْءٌ یُحَرِّکُہٗ
فَکِدْتُ اَصْنَعُ شَیْئًا فِی السَّرَاوِیْلِ

(ترجمہ) "اے میری قوم! میں نے تمہارے بعد ہاتھی کو دیکھا ہے اللہ تعالےٰ اس ہاتھی کے دیکھنے میں میرے لیے برکت دے ـــــ وہ اپنی کسی چیز (یعنی سونڈ) کو حرکت دے رہا تھا جب میں نے اس کو دیکھا تو ڈر گیا اور قریب تھا کہ میں اپنے پائجامہ میں کچھ کر دوں"

بہر حال "ہاتھی ہاتھی" کا آوازہ سُنکر حاضرین کی جماعت کے اکثر افراد امام مالکؒ کی صحبت اور مجلسِ درس اور افادات کو ترک کر کے ہاتھی کا تماشا دیکھنے کو دوڑ پڑے مگر یحیٰی بن یحیٰیؒ اپنی اسی ہیئت اور حالت کے ساتھ بیٹھے ہوئے فیض حاصل کرنے میں مشغول رہے اور نہ کسی قسم کا اضطراب پیش آیا اور نہ کوئی حرکت بیساختہ ان سے سرزد ہوئی، اُسی طرح اطمینان سے بیٹھے رہے جس طرح کہ پہلے بیٹھے تھے۔

امام مالکؒ نے فرمایا یحیٰی! تمہارے ملک اُندلس میں ہاتھی نہیں ہوتا؟ جاؤ تم بھی ہاتھی دیکھ کر آؤ۔ یہ تو امام مالکؒ کی شفقت تھی وہ چاہتے تھے کہ ان کے طبعی اور دلی تقاضے کیوں دبا دیئے جائیں آخر نوجوان ہیں انہیں بھی ہاتھی دیکھنے کا ارمان نہ رہے مگر امام یحیٰیؒ کے دل میں تو کچھ اور ہی خیال بس رہا تھا، جواب دیا کہ حضرتؒ! اُندلس سے میں آپ کو دیکھنے اور علم سیکھنے آیا ہوں، میں ہاتھی دیکھنے کے لیے اپنا گھر بار چھوڑ کر اتنے دور دراز کے سفر کی صعوبتوں کو برداشت کرنے پر آمادہ نہیں ہوا۔ امام مالکؒ نے سُنا تو اسی وقت سے ان کو "عاقل" کا خطاب مرحمت فرمایا اور آئندہ اسی نام سے پکارے جانے لگے، اُستاد کی دعا تھی، طلب صادق تھی تو خدا کا فضل بھی شاملِ حال تھا تحصیلِ علم میں کامیاب ہو گئے، دنیا کی عشرتوں اور طبعی تفریحوں کو بھی تج دیا مگر علم کی ملازمت اور

معیت ایک لمحہ چھوڑنے کو تیار نہ ہوئے، اس قدر خلوص، پختگی اور بلند عزائم کی برکتیں تھیں کہ اُندلس میں امام یحییٰ بن یحییٰؒ کو شاہانِ وقت کی نگاہوں اور بارگاہوں میں اس قدر جاہ و مرتبہ حاصل تھا کہ کوئی قاضی ان کے مشورہ کے بغیر مقرر نہیں کیا جاتا تھا۔

ابوعثمان صابونیؒ کو بھی اللہ تعالیٰ نے تحصیلِ علم کے وقت سے اخلاص اور طلبِ صادق کی دولت سے مالامال فرمایا تھا انہوں نے زمانۂ طالب علمی ہی سے علم کے صابون سے قلب و روح کی میل کچیل کو صاف کیا اور مسلمانوں کی صورت و سیرت میں امام ابوعثمان صابونیؒ اور اس طبقہ سے تعلق رکھنے والے صابون ساز اربابِ علم و کمال کی وجہ سے حُسن و خوبی کی بڑی قدریں پیدا ہوئی ہیں۔

امام ابوعثمان صابونیؒ کے تذکرہ کے بعد امام سمعانیؒ نے اُن کے جلیل القدر بھائی **ابویعلیٰ اسحٰق بن عبدالرحمٰن صابونیؒ** کا تذکرہ شروع کر دیا اور بتایا کہ امام ابوعثمان کا سارا خاندان علم و عمل کے لحاظ سے یکتا، دینداری اور خدا پرستی میں منفرد اور خدمت و اشاعتِ علم کے ذوق اور جذبۂ تبلیغ سے سرشار تھا۔ صابون سازی اور صابون فروشی ان کا کاروبار اور ذریعۂ معاش تھا مگر علم اور خدمتِ علم ان کے فضل و شرف کا وسیلہ اور عزت و افتخار کا امتیاز تھا۔ اسحاق صابونیؒ بھی اپنے بھائی کی طرح باکمال، عالم باعمل، دینی درد سے سرشار اور جذبۂ تبلیغ سے معمور تھے، بہت بڑے عالم اور اہلِ علم میں معتمد، ثقہ اور متدین تصور کیے جاتے تھے۔

تیسرے نمبر پر امام سمعانیؒ نے **ابومحمد عبیداللہ بن حسین صابونیؒ** کا تذکرہ اور تعارف کرایا، موصوف فقیہ اور محدث تھے، شہر انطاکیہ کے رہنے والے تھے، ان کی سب سے بڑی صفت یہ تھی کہ وہ اپنے بھائی کی طرح بے نفس تھے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ برہنہ شمشیر کے مقابلہ میں حق کو چھوڑنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا یہ مشکل ہے کہ انسان اپنے نفس کی برائیاں ازراہِ انصاف قبول کرلے .... تاریخ میں ایک ایسے جوانمرد بادشاہ کا ذکر ہے جس نے آٹھ ہزار فوج سے اسّی ہزار لشکرِ جرار کے منہ پھیر دیئے تھے اور اس وقت اس کی عمر صرف اٹھارہ برس کی تھی، لیکن یہ اولوالعزم فرمانروا اپنے نفس کے مقابلہ

ہیں ہمیشہ مغلوب رہا اس سے یہ نہ ہو سکا کہ اپنی غلطیوں کو غلطی مان کر راہِ صواب اختیار کر لیتا مگر آفرین ہے علماء سلف بالخصوص عبید اللہ صابونیؒ پر جنہوں نے اپنے نفس کی خود پسندی کو قابو میں رکھا اور کبھی اسے حق پر غالب نہیں ہونے دیا۔ علماء اسلام اور ائمہ امت کے تذکروں میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں اور فقہ کی کتابیں اس کی مثالوں سے بھری پڑی ہیں کہ امت کے پیشوا اماموں نے کئی مسئلوں میں اپنی ایک رائے ظاہر کی اور عقیدت کی مدد سے وہ مشرق و مغرب میں پھیل گئی اور ایک عالم میں اس پر عمل ہونے لگا پھر جب ان کو اپنی رائے کی غلطی پر انتباہ ہوا تو انہوں نے علی الاعلان اپنی پہلی رائے کو چھوڑ دیا اور اگر مسئلہ معلوم نہ ہوتا تو بغیر کسی جھجک کے لَا اَدْرِیْ کہہ دینے میں وہ فخر اور عزت و افتخار سمجھتے تھے۔

اس کے بعد امام سمعانیؒ نے ابو محمد عبد اللہ بن احمد صابونیؒ اور محمد بن عمر صابونیؒ کا ذکرِ خیر فرمایا، دونوں حضرات صابون سازی اور صابون فروشی کے پیشہ اور فن سے تعلق رکھنے والے علماء میں سے ہیں۔ اول الذکر بڑے عابد، زاہد اور اللہ والے بزرگ تھے۔ زہد کی صفت ان کے تذکرہ نگاروں نے خصوصیت اور نمایاں طور پر بیان کی ہے۔ کسبِ فیض اور تحصیلِ علم میں حمیت ان پر غالب رہی، دستِ سوال اور احتیاج و ضرورت اور فقر و افلاس کا اظہار گناہ سمجھتے تھے۔ اور یہ تو حضرت لاہوریؒ کا مقولہ ہے کہ شکایتِ حال شکایتِ ربِّ ذوالجلال ہے، اور پھر دور بھی وہی تھا جب بجلی نہیں تھی، مٹی کا تیل بڑی مشکل سے ملتا اور اگر ملتا بھی تو اتنے پیسے نہیں ہوتے تھے کہ اپنا چراغ جلایا جا سکے۔

اسلاف کی تاریخ کی ایک جھلک اس عنوان کے تحت بھی دیکھ لیجئے۔ فنِ حدیث کے عالی مرتبہ امام ابو حاتم رازیؒ اپنا قصہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں زمانہ طالب علمی میں چودہ برس بصرے میں رہا، ایک وقت فقر و افلاس اور تنگدستی کی یہ نوبت پہنچی کہ کپڑے تک بیچ کر کھا لیے، جب کپڑوں کی قیمت بھی خرچ ہو گئی تو دو دن بھوکا رہا آخر ایک رفیق سے اظہارِ حال کرنا پڑا خوش قسمتی سے اس کے پاس ایک اشرفی تھی اور وہ نصف اس نے مجھے دیدی۔

شیخ الاسلام ابو العلاء ہمدانیؒ کو بغداد میں اس حال میں کسی نے دیکھا کہ رات کو

مسجد کے چراغ کی روشنی میں جو بلندی پر تھا کھڑے کھڑے لکھ رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کو اگر روغن خریدنے کی مقدرت ہوتی تو اس قدر تکلیف اور صعوبت کیوں گوارا کرتے۔

حکیم ابو نصر فارابی رحؒ جن کا ایک عالم میں شہرہ ہے اُن کی نسبت بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ وہ عہدِ طالب علمی میں تہی دستی کی بدولت چراغ کا تیل خریدنے سے بھی معذور تھے تاہم ان کا شوق بیکار رہنے والا نہ تھا، رات کو پاسبانوں کی قندیلوں سے کام لیتے اور ان کی روشنی میں کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے۔ ایسی تنگ حالی میں انہوں نے وہ علمی ترقی کی کہ سارے جہان میں اپنا نام روشن کر دیا۔

یہ توضمن میں بات آگئی۔ عبداللہ صابونیؒ اور محمد صابونیؒ دونوں نے فقر و فاقہ، تنگدستی، عسرت اور غربت و مسافرت اور اساتذہ کی خدمت کی کٹھالی میں خود کو ڈھال دیا تھا اسی مزاج کے ہو گئے، اسی سانچے میں طوعاً ڈھل گئے تو سونا بن کر نکلے۔ آج بھی اُن کی سیرت و کردار اور اخلاق و اعمال کی روشنیاں چہار سُو جگمگا رہی ہیں۔ تاریخ کو ان پر فخر ہے اور مستقبل کے کامیاب طالب علموں کے لیے ان کی زندگی کارہائے نمایاں، نمونۂ عمل اور دعوتِ فکر و انقلاب ہیں۔

امام سمعانیؒ کی میٹھی اور عرفان و معرفت سے معمور گفتگو نے ہمیں آج ایک ہی محفل میں ان سے ایک دوسرے طبقہ یعنی طبقۂ زجاج کے صاحبانِ علم و فضل اور اربابِ کمال کے تذکروں اور افادہ اور ان کے فیوض و برکات اور روحانی و مطالعاتی توجہات سے استفادہ پر مجبور کر دیا۔ "الانساب" کا صفحہ ۲۷۲ سامنے ہے، زجاجی کے لقب سے یاد کیے جانے والے علماء کی ایک طویل فہرست ہے۔ زجاج عربی زبان کا لفظ ہے شیشہ کو کہتے ہیں۔ اس پیشہ سے اور اس کسب سے تعلق رکھنے والوں کو زجاجی کہتے ہیں علمائے اسلام اور سلف صالحین میں بہت سے حضرات کو دُنیا زجاجی کے لقب اور نسبت سے یاد کرتی ہے۔ اِن بزرگوں کے گھرانوں میں شیشے کے سامان اور آلاتِ زیبائش و آرائش بنتے اور فروخت ہوتے تھے اور علم و فضل کی دنیا میں شمس و قمر بن کر یوں چمکے کہ ان کی روشنی آج تک دنیا کو منور کر رہی ہے۔

الانساب کی اس طویل فہرست اور اجمالی تعارفی تذکرہ میں ابوالقاسم اسمٰعیل بن محمد زجاجی کا تذکرہ ہے جنہوں نے یوسف بن موسیٰ سے علمِ حدیث کی روایت کی، پھر طلبِ علم میں اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ لگے رہے حتیٰ کہ مسندِ درس پر جلوہ افروز ہوگئے اللہ تعالیٰ نے حافظہ کی دولت سے نوازا تھا۔ آج کے دور میں بھی دیکھا جارہا ہے کہ طلبہ اساتذہ سے حافظہ کی دُعائیں کرانے ہیں کچھ حکیموں کے پاس جاکر دوائیں حاصل کرتے ہیں مگر اصل دوا کی طرف کسی کی توجہ نہیں۔ گناہ کم کردو، معصیت کا راستہ چھوڑ دو، اللہ کے راستے پر گامزن ہو جاؤ حافظہ بھی اللہ پاک تیز کردیں گے۔ ہمارے اسلاف اور اکابر نے نہ تو تعویذات وادویات کو قبلۂ توجہ بنایا تھا اور نہ اس پر وہ اپنے قیمتی اوقات کو صرف کرنا مناسب سمجھتے تھے انہوں نے زندگی کو معصیت سے پاک رکھنے کی کوشش کی، مقدور بھر اسی میں لگے رہے تو اللہ کریم نے بہترین حافظوں سے نوازا۔ ان کا علم سفینہ سے زیادہ سینہ میں محفوظ ہوتا تھا، ان کے دماغ کتب خانے تھے جن میں علمی مسائل خوبی اور خوش اسلوبی سے چنے ہوئے تھے۔ آج متاخرین کے پاس سرمایہ فخر حاشیہ اور شرح نویسی ہے جبکہ متقدمین قوتِ حافظہ اور مجتہدانہ صلاحیتوں پر ناز کرتے تھے۔

استعدادِ حفظ اور کمالِ حفظ کی ایک مثال عرض کیے دیتا ہوں کہ خطیب بغدادیؒ نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ مشہور ادیب ابوعمرو زاہدؒ، قاضی محمدؒ کے صاحبزادے کو ادب کی تعلیم دیتے تھے، ایک روز انہوں نے اپنے شاگرد کو لغت کے تیس مسئلے اور ان کے آخر میں دو شعر لکھوائے، اتفاق سے اسی دن عہد مذکور کے تین استاذِ کامل ابن درید، ابن انباری اور ابوبکر، قاضی محمدؒ سے ملنے آئے۔ کثرتِ بیان کی وجہ سے بعض لوگ ابوعمروؒ کی نسبت یہ بدگمانی کرنے لگے تھے کہ وہ بہت سی باتیں طبعزاد بھی کہہ دیتے ہیں۔ لہٰذا قاضی صاحب نے وہ مسائل علماء موصوف کی خدمت میں پیش کیے اور ان کی تنقیح چاہی۔ ایک علامۂ وقت کے مسائل پر رائے زنی کرنا پوری ذمہ داری کا کام تھا۔ ابن انباریؒ اور ابوبکرؒ تو اپنے مشاغل کا عذر کرکے خاموش رہے۔ ابن دریدؒ نے بیساختہ کہا کہ ان مسائل کی لغت میں کوئی اصل نہیں سب ابوعمرؒ کے اپنے گھڑے ہوئے ہیں، ابوعمروؒ کو یہ خبر پہنچی تو قاضی صاحب موصوف کو کہلا

بھیجا کہ اپنے کتب خانے سے فلاں فلاں شعرائے عرب کے دیوان نکلوا دیجیے۔ چنانچہ وہ سب دیوان نکالے گئے، ابو عمرؒ نے ایک ایک مسئلے کر اس کے شواہد ان دیوانوں سے نکال نکال کر قاضی صاحبؒ موصوف کو دکھلانے شروع کیے اور اس طرح تیسوں مسئلے اہلِ زبان کے کلام سے ثابت کر دیئے، دو شعر جو اخیر میں لکھوائے تھے اُن کی نسبت کہا کہ میرے استاد ثعلبؒ نے فلاں اور آپ کے سامنے پڑھے تھے اور آپ نے فلاں کتاب کی پشت پر لکھ لیے ہیں، جب وہ کتاب بھی دیکھی گئی تو فی الواقع وہ شعر اس پر مرقوم تھے۔ ابن دریدؒ نے اس حال کو سنکر پھر کبھی کوئی لفظ ابو عمرؒ کی نسبت زبان سے نہیں نکالا۔

یہ تو حافظ کی بات بیچ میں آگئی شیشہ گروں کی اس فہرست میں دوسرے نمبر پر **محمد بن سعید زجاجی سرخسیؒ** کا تذکرہ ہے۔ ان کے اساتذہ حدیث میں اسحٰق بن ابراہیمؒ مروزیؒ زیادہ مشہور ہیں۔ علم کی تحصیل اور تکمیل کے بعد محمد زجاجیؒ نے بھی باقاعدہ درس و افادہ کا سلسلہ جاری رکھا۔ حافظ احمد بن علی اصفہانیؒ جیسے اہلِ علم اور فضلاء زمانہ نے ان سے تحصیلِ علم کو سعادت اور ان سے تلمذ کو استناد کا درجہ قرار دیا۔

ابو اسحٰق ابراہیم بن محمد زجاجیؒ اپنے طبقہ شیشہ گراں میں خاص امتیازی مقام کی حامل شخصیت ہیں، انہوں نے بغداد آکر ابو حامد احمد بن عباسؒ اور ابو احمد علی بن محمدؒ سے علمِ حدیث کی تکمیل کی، پھر اپنے اساتذہ اور ائمہ امت اور علماء باکمال کی طرح باقاعدہ درس و افادہ کا سلسلہ شروع کر دیا تو ابو بکر محمد بن عبد المالکؒ نے ان سے شرفِ تلمذ حاصل کیا اور پھر ان کے علوم و معارف کے محافظ، امین اور شارح بن کر خدمتِ علمِ دین میں ساری زندگی گذار دی۔

ابو بکر احمد بن علی زجاجیؒ کا ذکر امام سمعانیؒ نے بڑی محبت اور ادب و احترام سے کیا، انہوں نے بتایا کہ موصوف پیدائش کے اعتبار سے طبری ہیں مگر بغداد میں مستقل سکونت اختیار کر کے وہیں ابو حفص عمر بن ابراہیم کیانی مقریؒ سے حدیث پڑھی اور علوم و معارف کا کسبِ فیض کیا پھر علم کی اشاعت اور خدمت کے لیے اپنے اساتذہ کی طرح درس و افادہ کی مسند پر جلوہ افروز ہوئے۔ ابو بکر احمد بن علیؒ خطیب بغدادیؒ اور ابو القاسم خلف بن احمد خرقی مصریؒ

ان کے تلامذہ میں زیادہ مشہور رہیں۔

اس کے بعد عبد الرحمٰن بن ابو بکر زجاجیؒ اور ان کے اساتذہ اور تلامذہ کا اجمالی تذکرہ بھی ہوا۔ "الانساب" کو دیکھتے چلے جایئے تو طبقۂ شیشہ گراں سے تعلق رکھنے والے اربابِ علم و فضل کی ایک طویل فہرست مرتب کی جا سکتی ہے۔

آج کی مجلس میں امام سمعانیؒ کی طبیعت موج پر تھی جوشِ اشاعتِ علم عروج پر تھا ہماری طبیعت میں بھی سیری نہیں آتی تھی۔ سقراط کا مقولہ تو مشہور ہی ہے کہ "میرے علم کی معراج یہ ہے کہ میں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ مجھے کچھ نہیں آتا" اور جب کچھ نہ آنے کا تصور غالب رہے تو سیکھنے کے احتیاج کے جذبات کی انگیخت ہوتی ہے۔ مجھے بھی سیکھنے اور تحصیل کے اسی جذبے نے آج ایک ہی محفل میں تین طبقوں سے تعلق رکھنے والے اربابِ فضل و کمال کے تعارف اور ان کے حالات و کمالات سے آگاہی کے شرف کا موقع بخشا۔ قلم دوات اور سیکھنا اور لکھنا پڑھنا یہ تو ہمارا موروثی معاملہ اور اسلاف کا قیمتی ورثہ ہے۔ لکھا ہے امام ابن السنیؒ کے صاحبزادے فرماتے ہیں کہ میرے والد نے ایک روز لکھتے لکھتے قلم دوات کے منہ میں رکھا اور دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے، جو ہاتھ دعا کے واسطے اٹھے تھے پھر وہ قلم نہ اٹھا سکے اور عین حالتِ دعا میں روح عالم بالا کو پرواز کر گئی۔ ابن السنیؒ کا سن اُس وقت ۸۰ برس سے متجاوز ہو چکا تھا۔

الانساب کے اوراق پلٹے تو صفحہ ۳۵۷ سامنے تھا، صیادوں کے طبقہ میں علم اور علماء اور اربابِ فضل و کمال کا چرچا تھا۔ صیاد شکاری کو کہتے ہیں۔ علامہ سمعانیؒ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص پرندوں، مچھلیوں اور جانوروں کا شکار کرتا ہے اسے صیاد کہتے ہیں۔ شکاریوں کے طبقہ اور صیادی کے پیشہ والوں نے اس حدیث پر پورے طور پر عمل کیا ہے جس میں حکم دیا گیا ہے کہ قیدوا الاوابد، یعنی علم کے بدکے ہوئے مضامین اور علوم و معارف اور معانی و حکم کو حفظ و تحریر کے ذریعہ مقید کرو۔ جنگلوں، درختوں، باغوں، دریاؤں اور کہساروں میں صید و شکار کرکے انہوں نے علم کی تلاش میں دنیا کی خاک چھانی ہے اور ہر جگہ سے علم کو شکار کرکے کتابوں، درسگاہوں، سینوں اور سفینوں میں مقید کر دیا ہے۔ ان چڑی ماروں اور شکاریوں

میں بھی بڑے بڑے علماء دین، اکابر علم و فضل، باکمال علماء اور نامور فضلاء پیدا ہوئے ہیں۔ امام سمعانیؒ کی طویل فہرست سے چند ایک کا اجمالی تذکرہ درج ذیل ہے اور اسی پر ہم اپنے اس سلسلۂ تحریر کا اختتام کر رہے ہیں۔

ابو محمد احمد بن یوسف صیّاد بغدادیؒ بہت بڑے عالم، مدرس اور صاحبِ فضل و کمال بزرگ تھے خطیب بغدادیؒ نے بھی "تاریخ بغداد" میں ان کا تذکرہ کیا ہے بہت ثقہ اور مستند محدث اور باخدا عالم تھے۔ انہوں نے علم حدیث کی تعلیم ابو حامد محمد بن ہارون حضرمیؒ، اسمٰعیل بن عباسؒ وراق اور نفطویہ نحویؒ سے کی اور پھر جب درس و افادہ کی مسند پر جلوہ آراء ہوئے تو ابو القاسم عبد العزیز بن علیؒ جیسے سرآمد روزگار نے ان سے تلمذ اور انتساب کو اپنے لیے سعادت و استناد سمجھا۔

ابو بکر محمد بن احمد صیّاد بغدادیؒ، احمد بن یوسف صیادؒ موصوف کے بڑے صاحبزادے ہیں، اپنے والد کی طرح علم کے فریفتہ اور شیفتہ تھے۔ حدیث کے بارے میں بڑے سخت، محتاط اور بڑے پُر وقار تھے۔ ان کے اساتذہ میں ابو بکر شافعیؒ، ابو عبد اللہ محمد بن احمد احمد بن یوسفؒ، ابو بکر بن مالک قطیعی اور احمد بن جعفر ستقطیؒ جیسے جبالِ علم کے نام زیادہ مشہور ہیں

ابو عثمان سعید بن المغیرہ صیّاد بھی اپنے طبقہ صیاداں میں نامور عالم دین اور پاکباز خدا ترس فاضل گذرے ہیں، انہوں نے علمِ حدیث کی تحصیل کے لیے عامر بن سیافؒ ابو اسحٰق فزاریؒ، عیسٰی بن یونسؒ، خالد بن حسینؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، پھر مسندِ درس و افادہ پر جلوہ افروز ہوئے تو ایک عالم آن پر پروانہ وار جمع ہو گیا۔ ابو حاتم رازیؒ کا بیان ہے کہ جس وقت آپ نے "کتاب السیرۃ" کا درس دینا شروع کیا تو اہلِ مصیصہ اپنی اپنی دوکانوں کے دروازے بند کر کے ان کے حلقۂ درس میں آکر بیٹھ جایا کرتے تھے۔

ملاقات نمبر ۱۶

تذکرۂ اربابِ فضل وکمال

بصارت سے محروم اور بصیرت سے مالامال

(جو آنکھوں سے نابینا اور قلب کے بینا تھے)

"اربابِ علم وکمال اور پیشۂ رزقِ حلال" کی پندرہ قسطیں اب تک لکھی جاچکی ہیں اور اب ان کی کتابت ایک مستقل کتاب کی صورت میں اپنے آخری مراحل میں ہے۔ اس سے زیادہ لکھنے اور اسے آگے بڑھانے کا ارادہ نہیں ہے کہ اب وہ ہمتیں نہیں رہیں، ایک توکتاب کا حجم بڑھ جائے گا اور ممکن ہے کہ قارئین کے لیے طوالت بارِ خاطر بھی ہو۔ دونوں پہلوؤں کو ملحوظ رکھ کر خیال یہ کرلیا ہے کہ اب کی بار امام سمعانیؒ سے افادات کو آخری قسط کے طور پر لکھ دیا جائے اور اسی پر اکتفاء کرلیا جائے ــــ قارئین سے شکوہ نہیں کہ شوقِ مطالعہ کا فقدان ہے، کچھ ہوا ہی ایسی چل پڑی ہے۔ ایک وقت تھا جب ساری ساری رات دوکانداروں کی دوکانوں کے دروازوں سے، چراغوں کی روشنی کے دھاروں کو غنیمت سمجھ کر مطالعہ واستفادہ یا تحریر وتسوید میں گذر جاتی تھی۔ ایک ایک کتاب کے لیے طلبہ ترستے تھے، اربابِ ذوق پگھلتے تھے اور کتنے کتنے دور دراز علاقوں کے سفر کرتے تھے اور ایک اب کا دور ہے کہ کتب خانوں کی کثرت ہے، چھاپہ خانوں کی بہتات، طباعت ایسی کہ آنکھیں خیرہ ہوں، کاغذ ایسا کہ صحیفۂ ریشم معلوم ہو، کتابت اتنی صاف اور ایسی عمدہ کہ عقل دنگ رہ جائے، اب وہ کون سی کتاب ہے جو منصۂ شہود پر نہیں آئی، مگر استفادہ کون کرے؟

پڑھے گا کون؟ بڑے بڑے کتب خانوں میں دیکھا کرایہ کا ناظم اور لائبریری صرف کتابی ذوق کی تکمیل اور حسن وجمال کا ایک منظر، ذوق کا فقدان ہے، اشتیاق کا نام رہ گیا ہے، کیفیت لٹ گئی ہے، عشق کے الفاظ موجود ہیں، حقیقت عنقا ہے ؎

وصل ہو یا فراق ہو غالبؔ جاگنا ساری رات مشکل ہے

ہمارے اسلاف نے تو دل گردے اور خونِ جگر سے علوم نبوت اور فنونِ اسلامی کی آبیاری کی تھی اور اب وہ کہاں؟

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

اور نظر ڈالیں تو ہر طرف طوفان ہے، سیلاب ہے، فرصت کے لمحات میسر نہیں، عرب یونیورسٹیوں میں پہنچنے اور زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی فکر، حکومتی اداروں میں ملازمت کی ہوک اور بے چینی واضطراب، علم سند کے لیے اور سند ملازمت کے لیے، اور اگر کچھ مخلص رہ بھی گئے ہیں تو ان سے سیاست بازی کی چاٹ نے راستہ ہی گم کر دیا، بس پڑھا اور سند لی، دستارِ فضیلت باندھی تو رسم پوری ہو گئی اور کسی پارٹی کے ضلعی یا صوبائی صدر یا سیکرٹری یا کوئی عہدیدار مقرر ہو گئے گویا کمال حاصل ہو گیا ؎

فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی
رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی

میرا کسی سے کوئی گلہ نہیں کہ میں خود بھی اسی کشتی کا سوار ہوں مگر یہ حقیقت ہے کہ اب کے دور میں خطابت، جوش وجذبہ، راگ وترنم، اخبار وسیاست، کیمرہ اور وڈیو کیسٹ، بڑی تصویر، سیاسی مچھندروں سے ملاقات، خبر ناموں میں تذکرہ، گروہ بندی اور تحزب و ہلڑ بازی یا زیادہ سے زیادہ ممبری اور سیاسی شہرت کو مطمح کمال سمجھ لیا گیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بظاہر دین کا نام ہے مگر دین کے نام سے کیا کچھ نہیں کیا جا رہا ؎

لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
بیان اس کا منطق سے سلجھا ہوا لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد | محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا | یہ سالک مقامات میں کھو گیا
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے | مسلماں نہیں خاک کا ڈھیر ہے

کچھ اس قسم کے خیالات تھے، کچھ حیرت واستعجاب اور کچھ حسرت وافسوس کے تصورات تھے۔ یاس وقنوط کی ایسی تاریکیوں میں بعض اوقات امید کی روشنی کی کرنیں بھی پھوٹ پڑتی تھیں، اور سب سے بڑی چیز خدا کا فضل اور تقدیر کا قرعۂ فال اور انتخاب ہے تقدیر موافق ہو اور اللہ جب چاہیں تو بیناؤں اور داناؤں نہیں، طاقتوروں اور صحتمندوں نہیں، بیماروں اور لاغروں، اپاہجوں اور نابیناؤں سے بھی وہ کام لے لیتے ہیں جو بیناؤں کی اکیڈمیاں بھی انجام نہیں دے سکتیں۔

گذشتہ صفحات میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ بڑھیوں، مزدوروں، موچیوں اور تیلیوں سے خدائے دین کا وہ کام لیا جس کے لیے بڑے بڑے وزیر اور ارباب اقتدار ترستے رہ گئے مگر خدا تعالیٰ نے توفیق نہیں بخشی۔

اور آج جو تاریخ نے مبارک بن دھانؒ کا نام محفوظ رکھا ہے اور ملت ان پر فخر کرتی ہے۔ کیا وہ کسی ملک کے سربراہ تھے، صدر یا وزیر تھے؟ ہرگز نہیں، وہ تو ایک تیلی کے بیٹے تھے اور نابینا تھے مگر قرآن مجید کے حافظ، ابن الانباریؒ اور ابن خشابؒ کے تلمیذ خاص اور علمِ ادب کے ماہر و متخصص، علمِ حدیث پر کامل عبور، طاہر قدسیؒ کے سامنے تحصیل علمِ حدیث کے لیے زانوئے تلمذ تہہ کیا، پہلے حنبلی تھے پھر حنفی ہو گئے، فقہ حنفی کے جزئیات تک پر ایسا عبور تھا کہ آنکھوں والے بھی دیکھ دیکھ کر ان پر رشک کرتے تھے۔ پھر مدرسہ نظامیہ میں مدرس ہو گئے مگر مدرسہ نظامیہ والوں نے نحوی استاذ کے لیے شافعی ہونا ضروری قرار دیا تھا، ذوقِ تدریس اور غلبۂ افادہ کے پیشِ نظر حنفیت چھوڑ کر شافعی ہو گئے۔

اُن کی مذہبی آزادی کے چرچے تھے، ایک شاعر نے سُنا تو بہت غصہ آیا اور درج ذیل اشعار لکھے ؎

وَمَن مُبلغ عَنّی الوَجیہَ رِسَالَۃً | وَاِن کَانَ لَاتُجدِیْ اِلَیہِ الرَّسَائِلُ

تَمَذْهَبتَ لِلنُّعْمَانِ بَعْدَ ابْنِ حَنْبَلَ　　وَ ذٰلِكَ لَمَّا اَعْوَزَتْكَ الْمَآكِلُ
وَمَا اخْتَرْتَ قَوْلَ الشَّافِعِيِّ تَدَيُّنًا　　وَلٰكِنَّمَا تَهْوِي الَّذِي مِنْهُ حَاصِلُ
وَعَمَّا قَلِيْلٍ اَنْتَ لَا شَكَّ صَائِرٌ　　اِلٰى مَالِكٍ فَافْطِنْ لِمَا اَنَا قَائِلُ

(ترجمہ) "میری طرف سے کوئی وجیہ (مبارک کا لقب تھا) کو یہ پیغام پہنچا دے اگرچہ پیاموں سے اس کو کوئی نفع نہیں کہ امام احمد بن حنبلؒ کے بعد تو نے ابو حنیفہؒ کا مذہب اختیار کیا اور یہ اُس وقت جب کھانے پینے کی تنگی ہوئی، امام شافعیؒ کا مذہب تُو نے دیانتداری سے تھوڑا ہی قبول کیا ہے بلکہ جو اس سے آمدنی ہوگی وہ پیشِ نظر ہے، اس میں شبہ نہیں کہ تو ایک روز خدا کے سامنے جائے گا پس جو میں کہتا ہوں اُس کو غور سے سُن لے۔"

یہ اشعار تو احقر نے علمی تفکہ، طبعی ظرافت اور مطالعاتی تفریح کے طور پر نقل کر دیئے ہیں۔ آخر جن کے خلاف شعراء بھی لنگر لنگوٹ کس کر اس طرح میدان میں آ اُتریں اور وہ بیچارہ ہو بھی نابینا، تو اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علمی قدر و منزلت کے کس مقام پر وہ پہنچے ہوئے تھے۔

موصوف ابن الدهان نحوی کے ایک دوسرے شاگرد تھے، مکی نام تھا، ابو الحزم کنیت اور صائن الدین لقب، نابینا اُستاد کے شاگرد بھی نابینا تھے۔ ۸، ۹ برس کی عمر میں آنکھیں جاتی رہیں۔ اُستاد تیلی کا بیٹا اور شاگرد موچی کا بیٹا، بیچارے کے والد چمڑے کا کاروبار کرتے تھے، ناداری اور فقر کی حالت میں فوت ہوئے اور پسماندگان کے لیے سوائے غربت و افلاس کے کچھ نہیں چھوڑا۔ بے چارہ صائن الدین تو تھا ہی نابینا، دوسرے کے کندھوں کا بوجھ، گھر میں کوئی کمانے والا بھی نہ تھا، آخر موصوف نے چھوڑا ہی کیا تھا، ایک بیوی، ایک بیٹی اور ایک نابینا بیٹا صائن الدین۔ ماں تنگدستی اور گھریلو کفالت کے ہاتھوں تنگ آ گئی، فاقے پہ فاقے ہونے لگے، بیچاری لختِ جگر صائن الدین پہ گھبرانے لگی۔ ہونہار بیٹا سمجھ گیا تھا ماں کی حالتِ زار اور گھر کی عسرت و افلاس کی

کیفیت دیکھی تو نکل کھڑے ہوئے۔ نابینا صائن الدین موصل سے پہنچا، یہاں قرآن مجید حفظ کیا، فن ادب کی تحصیل اور تکمیل کی، پھر موصل سے بغداد آئے اور راستے میں آنکھوں کی تاریکی اس کا راہ نہ روک سکی۔ ابن انباریؒ، ابن خشاب اور مبارک بن دھانؒ جیسے باکمال حضرات سے علم وفضل کا بھرپور استفادہ کیا۔ جب یہاں سے فارغ التحصیل ہوئے تو پھر موصل پہنچے اور مسندِ درس و افادہ پر جلوہ افروز ہو گئے، پڑھانا شروع کیا، علم وفضل اور وہبی استعداد و صلاحیت اور علمی کمالات کی قوت شہر شہر اور قریہ قریہ ان کی شہرت کو لے پہنچی۔ پھر کیا تھا طلبہ کی ٹولیوں کی ٹولیاں آ آکر استفادہ کرتیں۔ ابن مستوفی نے لکھا ہے کہ:۔

"مرحوم نابینا تھے مگر جامع فنونِ ادب، حجتِ کلام عرب، ان کی دانشمندی اور دینداری پر سب کا اتفاق تھا، حدیث کا علم بہت وسیع تھا، اپنی ذات کو قرآن مجید اور ادب کے سارے شعبوں کی تحصیل کیلئے وقف کر رکھا تھا۔"

تحصیلِ علم سے فارغ ہوئے تو وطن یاد آیا، اپنے آبائی گاؤں ماکسین واپس پہنچے جہاں بچپن میں لوگ انہیں مکیکی کہا کرتے تھے، جب عالم بن کر واپس لوٹے تو اہلِ وطن نے اپنے شہر کا انہیں فخر سمجھ کر ان کا زبردست اکرام کیا، سر آنکھوں پر بٹھایا۔ ایک روز صبح کو حمام جا رہے تھے۔ راستہ میں سُنا کہ ایک عورت اپنے بالاخانہ پر بیٹھی اپنے ہم نشین سے کہہ رہی تھی کہ تم نے سُنا ہے کہ فلاں کا بیٹا مکیکی آیا ہوا ہے۔ مرحوم اپنا بگڑا ہوا نام سُنکر بگڑ گئے اور کہنے لگے جہاں میرا نام بگاڑا جائے وہاں میں نہیں ٹھہر سکتا، فوراً موصل کو چل دیئے، اپنے نابینا اُستاد مبارک دھانؒ کے شہر میں خدمت علم میں لگ گئے اور جب وفات ہوئی تو ان ہی کے پہلو میں آسودۂ خاک ہوئے۔

صائن الدینؒ کو شعر سے بڑا لگاؤ تھا، شعر خوب کہتے تھے مشہور نابینا شاعر ابوالعلاء معریؒ کے بڑے مداح اور معتقد تھے اور انہی کے طرز کا تتبع کرتے تھے۔ یہ وہی ابوالعلاء معریؒ ہیں جن کے سامنے جب بھونا ہوا تیتر رکھا گیا تو اس نے اس میں فکر و تامل اور قدرے توقف کے بعد اقبال مرحوم کے الفاظ

میں ؏ ہے جُرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

کا فلسفہ بیان کیا۔

مجھے معرّی کے اس عظیم فلسفہ انقلاب اور قوموں کے عروج و زوال کی داستان کے محور اور مرکزی نقطہ کی نشاندہی سے اس کے حالات وسوانح، اس کی تاریخ اور اس کے کارنامے جاننے کا شوق ہوا، بہت سوچتا رہا کہ یہ مسئلہ کس سے حاصل ہوگا کس کے پاس جاؤں گا، کون بتائے گا اور خدا جانے کوئی میری بات سننے کے لیے تیار ہوگا بھی یا نہیں، یہ کشمکش تھی اُدھر اپنے محبوب و عظیم سکالر اور ثقہ مؤرخ امام سمعانیؒ کی روح متوجہ ہوگئی، کام بن گیا "الانساب" کا دریچہ کھل گیا، صفحہ ۵۳۶ کی پشت پہ دوسری سطر کے آخر پر معرّی کی شہ سرخی قائم تھی، کام بن گیا۔ معرّی شام کے ایک شہر "معرۃ النعمان" کی طرف نسبت ہے۔ اس نسبت سے بڑے بڑے اکابر، علماء، ائمہ فن اور محدثین معروف ہیں۔ امام سمعانیؒ نے ابوالعلاء معریؒ کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:۔

الشاعر المعروف البحر الذی لا ساحل لہٗ فی اللغۃ۔	معری مشہور شاعر ہیں اور حفظ و معانی لغت میں گویا ایسے دریا ہیں جس کا کوئی ساحل نہیں

امام سمعانیؒ کے حوالے سے ابوالعلاء معری اور اس سے قبل بھی دو نابیناؤں کا تذکرہ جو آپ نے سُنا، مجھے تو پڑھ پڑھ کر خدا کی قدرت ہی یاد آتی ہے، یہ اس کی کارفرمائی کے کرشمے اور نیرنگیاں ہیں اور ہماری ماضی کی تاریخ کے روشن اور قابلِ فخر ابواب۔ گو آنکھیں اللہ تعالیٰ کا ایک بیش بہا عطیہ ہے مگر ہمارے اسلاف نے اس نعمت سے محروم ہونے کے باوجود خود کو عضوِ معطل خیال کر کے دوسروں کی دست نگری کی ذلتوں سے خود کو محفوظ رکھا وہ سمجھتے تھے کہ جب آنکھیں نہ ہوں اور انسان یہ فیصلہ کر لے کہ اب وہ کسی کام کا نہیں تو یہ ان بیش بہا قوتوں اور نعمتوں کی ناشکری ہے جو خداوند عالم نے علاوہ آنکھوں کے انسان کو بخشی ہیں۔ لاریب۔ آنکھ دماغ کا مُخبر ہے، مگر انہوں نے مخبر کے کام آجانے سے رئیس اور سردار کو بے کار تسلیم نہیں کیا۔

مذکورہ تین نابیناؤں کے تذکرہ میں آپ نے پڑھا اور آج سے صدیوں قبل جب

تحصیل علم کے موجودہ آسان ذرائع بھی حاصل نہیں تھے، انہوں نے تحصیل علم کے شوقِ تکمیل میں دور دراز ممالک کے سفر کی صعوبتیں اٹھائیں، اساتذہ فن کی خدمت میں منزلیں طے کر کے حاضر ہوئے، اس زمانے کے استاذ بھی شفیق تھے تنخواہ کے لیے نہیں اللہ کے لیے کام کرتے تھے۔ ذہین، طباع اور دقیقہ سنج تھے، اپنے تلامذہ خواہ وہ نابینا ہی کیوں نہ ہوں کے اذہان صحیح معلومات سے معمور کر دیتے تھے۔ اس زمانہ کے ایک نابینا مسلمان عالم سے جو علوم عربیہ کے فاضل اور باکمال طبیب بھی تھے، سوال کیا گیا کہ جناب! جب آپ کی آنکھیں ہی نہیں ہیں تو آپ کو اقلیدس کی شکلوں کی ہیئت کذائی کیونکر معلوم ہوتی؟ انہوں نے جواب میں کہا میرے استاذ نے میری پشت کو سلیٹ اور اپنی انگلی کو قلم بنالیا تھا، دائرہ مثلث وغیرہ کی شکل وہ اپنی انگلی سے میری پشت پر کھینچ دیتے تھے تو اس ذریعہ سے اشکال کی ہیئتِ خاص میرے ذہن میں آجاتی تھی۔

بات ابو العلاء معری کی چل رہی تھی تو امام سمعانیؒ نے بھی ان کے بارے میں یہی بتایا کہ موصوف بلند پایہ لغت دان، ادیب اور شاعر تھے۔ علامۂ عصر اور فنونِ ادب کے عالی رتبہ اور کامل تھے، آنکھیں ان کی بچپن میں چیچک نے چاٹ لی تھیں، ماحول علمی تھا، والد ان کے بڑے نحوی تھے علم النحو کا اپنے والد سے بھرپور استفادہ کیا۔ شوقِ طلب نے رحلتِ سفر کی راہ پر ڈال دیا، حلب پہنچے تو امامِ نحو ابن سعدؒ سے فنِ نحو کی مزید تکمیل کی عمر کی گیارھویں بہار تھی کہ طبیعت شعر کی طرف مائل ہو گئی۔ عنفوانِ شباب میں دو مرتبہ بغداد کا سفر کیا، نابینا تھے مگر دردِ دل اور شوقِ طلب کی آنکھیں پرنور تھیں، ایک جگہ آرام سے کب بیٹھ سکتے تھے، دربدر شہر شہر جہاں بھی چشمۂ علم وفن کی خبر پاتے پہنچ جاتے اور مقدور بھر سیراب ہوتے۔ بغداد کے دوسرے سفر میں ڈیڑھ سال سے زائد عرصہ تک قیام کیا یہاں کے دار العلم اور دار الکمال سے سندِ فراغ حاصل کی تو اپنے آبائی گاؤں واپس تشریف لے گئے اور درس و تدریس اور افادہ وفیض و علم کی مسند پر جلوہ افروز ہو گئے، سلسلۂ درس مقبول ہوا، طلبہ گروہ در گروہ آتے، کسبِ فیض کرتے۔ نابینا تھے مگر ذوقِ تصنیف بھی غالب تھا۔ نامور علماء، وزراء اور اس زمانے کے ذی رتبہ اور معززین سے برابر خط و کتابت اور

مذاکرے جاری رہتے تھے۔

ابوالعلاء از راہِ ظرافت اپنے خطوط میں خود کو "رہین الجبین" لکھا کرتے تھے۔ یعنی دوہرے قیدخانے کا قیدی، ایک قید تو نابینائی کی تھی اور دوسری خانہ نشینی کی۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ۴۵ پینتالیس برس گوشت نہیں کھایا، اس بارے میں وہ حکمائے قدیم کے ہم خیال تھے کہ اپنی نفسانی خواہش پوری کرنے کے لیے کسی کی جان لینا زیبا نہیں۔ اقبال مرحوم نے بھی اس قسم کے ایک واقعہ کو اشارہ کر کے قوم و ملت اور مسلمانوں کے عروج و زوال کے فلسفہ اور حکمت و مصلحت کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معرّیؔ — پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ گذر اوقات
اک دوست نے بھونا ہوا تیتر اسے بھیجا — شاید کہ وہ شاطر اسی ترکیب سے ہو مات
یہ خوانِ تروتازہ معرّی نے جو دیکھا — کہنے لگا وہ صاحبِ غفران[۱] و لزومات[۲]
اے مرغکِ بے چارہ ذرا یہ تو بتا تو — تیرا وہ گناہ کیا تھا یہ ہے جس کی مکافات
افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو — دیکھے نہ تیری آنکھ نے فطرت کے اشارات

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

ابوالقاسم تنوخیؒ اور خطیب تبریزیؒ جیسے سرآمدِ روزگار شخصیتیں معرّی کے تلامذہ میں سے ہیں۔ فہرستِ تصانیف پر نظر ڈالیے تو قوتِ کمال پر حیرت ہوتی ہے۔ فنِ ادب میں ایک ایسی تصنیف بھی لکھی ہے جس کی بمشکل سو جلدوں میں تکمیل ہو سکی۔

معرّی کے تذکرہ سے ابوالحسن مصریؒ کا تذکرہ بھی بے جا نہ ہوگا وہ بھی نابینا تھے مگر فقہ شافعی کے جلیل القدر امام اور بڑے رتبہ کے شاعر تھے۔ فقہ شافعی میں ان کی وقیع تصانیف کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ شعری ذوق بھی فطرتِ سلیم کی عکاسی کرتا ہے۔

---

[۱] غفران۔ رسالۃ الغفران معرّی کی ایک مشہور کتاب کا نام ہے۔

[۲] لزومات۔ معرّی کے قصائد کا مجموعہ ہے۔

شیخ ابو اسحاق شیرازیؒ نے "طبقات الفقہاء" میں ان کا کلام نقل کیا ہے ؎

عَابَ التَّفَقُّهَ قَوْمٌ لَا عُقُولَ لَهُمْ ۔۔۔ وَمَا عَلَيْهِ إِذَا عَابُوهُ مِنْ ضَرَرٍ

مَا ضَرَّ شَمْسَ الضُّحَى وَالشَّمْسُ طَالِعَةٌ ۔۔۔ أَنْ لَا يَرَى ضَوْءَهَا مَنْ لَيْسَ ذَا بَصَرٍ

(ترجمہ) "فقہ کو بے عقل لوگ برا کہتے ہیں، ان کے برا کہنے سے فقہ کا کچھ نقصان نہیں، بلند اور روشن آفتاب کی روشنی کو اندھا نہ دیکھے تو آفتاب کا کیا نقصان"۔

اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ اشعار آپ کے وہ ہیں کہ جب قحط پڑا اور آپ کو بے حد زحمت ہوئی، صعوبت اور تکلیف اٹھائی، صبر کیا، لیکن صبر کی بھی آخر ایک حد ہوتی ہے، جب بے قرار ہوئے تو مضطربانہ شب کو مکان کی چھت پر چڑھ گئے اور بآواز بلند یہ کلام پڑھا ؎

الْغِيَاثَ، الْغِيَاثَ، يَا أَحْرَارُ ۔۔۔ نَحْنُ خِلْجَانُكُمْ وَأَنْتُمْ بِحَارٌ

إِنَّمَا تَحْسُنُ الْمُوَاسَاةُ فِي الشِّدَّةِ ۔۔۔ لَا حِينَ تَرْخُصُ الْأَسْعَارُ

(ترجمہ) "اے احرار! الغیاث، الغیاث، تم دریا ہو، ہم تمہاری لہریں ہیں گرانیوں میں سلوک خوب ہوتا ہے نہ کہ جب نرخ ارزاں ہوں"۔

لکھا ہے کہ نیک دل پڑوسیوں کے دل میں اس کلام کی یہ تاثیر ہوئی کہ صبح کو ابوالحسن بصری کے دروازے پر گیہوں کا ایک انبارِ عظیم لگا ہوا تھا۔

مجھے اب جب اس سلسلہ میں تحقیق اور تجسس کی ضرورت پیش آئی تو تاریخ و تذکرہ اور اسماء الرجال کی کتب کی ورق گردانی کی تو یہ بات پہلی مرتبہ معلوم ہوئی کہ مسلمانوں میں نابینا فضلاء کی ایک بڑی تعداد ایسی بھی ہے جو بینا فضلاء پر علمی مسابقت میں برتری لے گئی ہے۔ ان کے حالات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علم تفسیر، حدیث، فقہ، ادب، فرائض، حساب، غرض وہ کون سا علم ہے جس میں نابینا فضلاء نے کمال حاصل نہ کیا ہو اور پھر بعض حضرات تو ان میں اپنے فن کے اعتبار سے ایسے باکمال ہوئے ہیں کہ بینا علماء میں بھی ان کی نظیر مشکل سے ملتی ہے۔ انہوں نے بڑی بڑی کتابیں تصنیف کیں، ان کے

حلقہ ہائے درس میں بڑے بڑے نامور علماء پیدا ہوئے۔

حضرت قتادہؒ جلیل القدر تابعینؒ میں سے ہیں، بلند پایہ مفسر تھے، تفسیر کے علاوہ حدیث، علم انساب، تاریخ عرب، علم ادب اور لغت میں ان کی جلالت شان اور کمال مسلم ہے۔ ان کی جلالت علم اور فضل و تفوق کا اس سے اندازہ لگائیے۔

ابو عبیدہؒ کی روایت ہے کہ کوئی دن ایسا نہ گذرتا تھا کہ جب خلیفۂ دمشق کا قاصدِ شتر سوار ان کے دروازہ پر مذکورہ علوم سے متعلق کوئی نہ کوئی مسئلہ دریافت کرنے نہ آتا ہو، مگر بایں ہمہ کیا وہ آنکھوں والے تھے؟ کیا انہوں نے اسلامی کتابوں کو بصری آنکھوں سے دیکھا تھا؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں۔ ان کی نگاہوں کی بصارت قدرت نے لے لی تھی مگر قلب کی بصیرت سے مالا مال کر دیا تھا، نظر کے نابینا تھے مگر قلب کے بینا تھے انہوں نے نابینائی اور معذرت و احتیاج کی حالت میں طلبِ علم کی وادی میں قدم رکھا تو استقامت میں اپنی مثال آپ نکلے، طلبِ علم میں ایسے مخلص کہ جب سعید بن المسیبؒ کے پاس استفادہ و تحصیلِ علم کے لیے حاضر ہوئے اس قدر ذوق، کوشش اور وجد و خلوص کے ساتھ کہ نابینا شاگرد سے بینا اُستاد گھبرا اٹھے۔ ابھی تین روز تلمذ کے پورے نہیں ہوتے تھے کہ ابن المسیبؒ نے کہا ارے نابینا! یہاں سے نکل جائیے کہ تم نے ہمیں نچوڑ دیا ہے ــــ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے کبھی بھی استاذ اور محدث سے حدیث کے اعادہ کی درخواست نہیں کی، جو بات کان میں پڑی ایک بار سُن لی تو حافظہ میں محفوظ ہو گئی۔

فتنۂ اعتزال کو جو معتزلہ کا نام ملا اس میں بھی حضرت قتادہؒ کا قول اصل بن گیا ہے لکھا ہے کہ آنکھیں نہیں تھیں مگر بصرہ کے بلند و پست گلی کوچوں میں بے تکلف بغیر کسی رہبر کے پھرا کرتے تھے، ایک روز پھرتے پھراتے ایک مسجد میں پہنچے وہاں ابن عبیدؒ وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے۔ اتفاقاً اسی وقت ان لوگوں نے حضرت حسن بصریؒ کا حلقہ چھوڑ کر اپنا حلقہ جدا قائم کر لیا تھا، ان کی آواز سُن کر حضرت قتادہؒ سمجھے کہ حسن بصریؒ کا حلقہ ہے جب قریب آئے گفتگو سُنی تو اصل حقیقت واضح ہوئی، اس وقت بے ساختہ ان کی

زبان سے نکلا۔

هٰؤلآءِ المعتزلہ ۔ | یہ تو معتزلہ کی جماعت ہے۔

اسی روز سے گروہ مذکور کا یہی نام پڑ گیا اور حضرت قتادہؒ نے طاعون کے مرض سے وفات پائی۔

امام سمعانیؒ نے ابو العلاء معری کا تذکرہ کیا تو تاریخ نے کئی نابیناؤں کی عظمتیں جو اپنے دامن میں سمیٹ رکھی ہیں ظاہر کر دیں۔ کئی ادیب، کئی فضلاء، کئی شعراء جن کی عظمت کی آج ایک دنیا قائل ہے جن کے اشعار ادب کی جان ہیں، جن کا قول سند ہے، پہلی بار معلوم ہوا کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے نگاہوں کی بصارت کے بجائے قلبی بصیرت ودیعت فرمائی تھی۔

علی قیروانیؒ مشہور شاعر اور فنِ تجوید و قرأت کے امام مسلّم مانے جاتے ہیں، نابینا تھے اور طبیعت کی روانی اور ادب و عربی دانی کا ذوق اور قرأت و تجوید کا یہ عالم تھا کہ امام نافعؒ کی قرأت کا ایک قصیدہ دو ہزار نوے (۲۰۹۰) اشعار میں لکھا۔ جب اندلس پہنچے تو وہاں ان دنوں علم ادب کا بڑا چرچا تھا، جب بادشاہوں کو ایک ادیب کامل کی آمد کی اطلاع ملی تو انہوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا، سر آنکھوں پر بٹھایا۔ ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے تاہم طبیعت کا میلان ہجو کی طرف زیادہ تھا اور یہ اشعار بھی ان ہی کے دیوان سے نقل ہوتے چلے آئے ہیں ؎

أَقُوْلُ لَهٗ وَقَدْ حَيَّا بِكَاسٍ | لَهَا مِنْ مِسْكِ رِيْقَتِهٖ خِتَامٌ
أَمِنْ خَدَّيْكَ تُعْصَرُ قَالَ كَلَّا • بَلْ عُصِرَتْ مِنَ الْوَرْدِ الْمُدَامُ

(ترجمہ) ساقی نے ایک جام جس میں اُس کے لعابِ دہن کی آمیزش تھی مجھ کو دے کر زندہ کر دیا تو میں اُس سے پوچھتا ہوں کہ کیا یہ تیرے رخساروں سے ٹپکی ہے، وہ کہتا ہے نہیں، کہیں گلاب کے پھول سے بھی شراب کھینچا کرتی ہے؟

علی قیروانیؒ کے علم قرأت میں مہارت کے تذکرہ سے قرأت کے مشہور امام ابو محمد امام شاطبیؒ کا ذکرِ خیر کر دینا بھی مناسبت اور موضوع سے موافقت اور افادہ

کے لحاظ سے بے جا نہیں۔ موصوف شاطبیہ کے باشندے تھے۔ ۵۳۸ھ میں پیدا ہوئے فن قراءت کے مشہور شارح اور امام ہیں، تفسیر اور حدیث پر پوری دسترس حاصل تھی، فنِ نحو اور لغت میں بھی بے نظیر تھے، علم تعبیر سے واقف تھے مگر دنیوی نظروں سے محروم، بظاہر نابینا مگر علوم ومعارف کے بینا اور دانا تھے۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور مؤطا پر ایسا کامل عبور تھا کہ جب طلبہ پڑھتے تو یہ اپنے حافظہ سے ان کے نسخوں کی تصحیح کراتے جاتے اور کثرت سے مسائل کا استنباط اور نکات کا استخراج کرتے۔ علمِ قراءت پڑھاتے تب بھی باوضو اور پُرخشوع رہتے۔ جب ۵۷۲ھ میں مصر تشریف لے گئے تو سلطان صلاح الدین کے باکمال وزیر قاضی فضل کے مہمان ہوئے۔ وزیرِ مصر نے مہمانِ عزیز کی یہ ضیافت کی کہ خاص ان کے لیے ایک مدرسہ تعمیر کرایا، امام شاطبیؒ مدرسہ مذکور میں کلامِ مجید، قراءت، نحو اور لغت پڑھایا کرتے تھے، ان کی ذات نے ایک عالم کو فیض پہنچایا۔

عجیب اتفاق ہے کہ آخری قسط نابیناؤں کے تذکرہ کے لیے وقف ہو گئی، تقدیر کا یہ فیصلہ بھی حکمت سے خالی نہیں ہوگا تاہم فکر وتامل کرنے والوں کیلئے نابیناؤں کے تذکرہ میں عبرت وحمیت کا کافی اور مؤثر سبق موجود ہے۔ اب تو مسلمانوں پر افسوس اور حیف اور بعض اوقات ان کے اعراض واستکبار پر رونا آتا ہے۔ وی سی آر اور ٹیلیویژن نے تو کتب بینی اور ذوقِ کتب کا جنازہ نکال دیا ہے، اخبارات نے کتب بینی کے رواج کو بتدریج ختم کر دیا ہے، چند ایک جو علمی گھرانے چلے آرہے تھے وہاں مروجہ مغربی سیاست بازی نے بے دینوں سے آگے بڑھنے اور مکروفریب کا نیا عالمی ریکارڈ قائم کرنے میں ایسے گل کھلائے کہ شیطان بھی کان پکڑ کر علیحدہ بیٹھ گیا کہ اللہ میری توبہ!

علم ہو یا عمل، ذوقِ کتب ہو یا شوقِ مطالعہ، یہ خدا تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اب تو ہم آنکھوں والے بھی ان چیزوں کی قدر نہیں کرتے جس کو ہمارے اسلاف میں نابیناؤں تک نے آنکھوں سے لگایا ہوا تھا۔ کاش! ان نابیناؤں کے تذکرہ سے ہماری آنکھیں کھلتیں، عبرت حاصل ہوتی اور سوچتے کہ خدا تعالیٰ کی عطا فرمودہ قوتوں، صلاحیتوں، عافیت اور وسائل سے کام نہ لینا اور ان کو خدا کے کام میں صرف نہ کرنا پرلے درجے کا

کفرانِ نعمت ہے۔ جس روز نعمتوں کا حساب ہوگا اس روز بارگاہِ ربوبیت میں تم سے کیا جواب ہوگا؟

وَلَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ۔

(سورۃ التکاثر آیت ۸)

کی وارننگ سنتے اور اس پر کان دھرتے، عمل کی فکر کرتے، فکر کا اہتمام کرتے تو جدھر قدم اٹھاتے کامیابی قدم چومتی، آخرت کی سرفرازیاں اس پر مستزاد۔

اپنے آباؤ اجداد کی تاریخ، ان کے کارناموں اور ان کی عظمتوں سے انتساب پر فخر و مباحات اپنی جگہ نافع مگر اسے ہمت اور جوانی نہیں کہتے، اسے پامردی اور شجاعت نہیں کہتے ؎

إِنَّ الْفَتَىٰ مَنْ يَقُولُ هَا أَنَا ذَا
لَيْسَ الْفَتَىٰ مَنْ يَقُولُ كَانَ أَبِي

جوان تو وہ ہیں جو دھارے کا رُخ بدل دیں، جو زمانے کو اپنے پیچھے لگا دیں ؎

ناز کیا اس پہ کہ بدلا ہے زمانے نے تجھے
مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

بہر حال کوئی ملنے یا نہ مانے حق کہنا آسان ہے، حق سنانا آسان ہے، دسیوں زندہ باد کہنے والے مل جاتے ہیں، آفرین بھی ہوتی رہتی ہے مگر حق سننا اس سے بھی مشکل ہے اور انسانیت کی معراج اور کمال یہ ہے کہ حق سننے کا حقِ سماع ادا کرے۔ برہنہ شمشیر کے مقابلے میں حق کو نہ چھوڑنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا یہ مشکل ہے کہ انسان اپنے نفس کی برائیاں ازراہِ انصاف قبول کرے۔

آئیے امام سمعانیؒ نے جن باکمال علماء، فضلاء کا تذکرہ کیا یا اس کے ضمن میں تاریخ و تذکرہ کی کتابوں سے جو اربابِ علم و کمال سرآمدِ روزگار شخصیتوں کے حالات بیان ہوئے ان کا پَرتو، ان کی جھلک، ان کی تقلید اور ان کا نمونۂ عمل اپنی زندگیوں میں اپنالیں۔ غیرت و حمیت

سے کام لیں اور یہ کوئی عیب نہیں بلکہ کمال ہے کہ کسی کی تنبیہ پر پھر سے استقامت وعزیمت اور اپنی تاریخی عظمت اور غیرت وحمیت کا بھرپور مظاہرہ کریں۔ سچی بات دل پر اثر کرے تو ایمان کے ہونے کا یقین کریں، اور اگر سچی بات کم ازکم ندامت یا اس سے بھی کم برائی کو واقعتہً برائی کے باور کرانے تک میں مؤثر نہ ہو تو پھر دل میں کھوٹ ہے اصلاح پر توجہ دینی چاہیئے۔

پہلے زمانے میں سچی بات کیسے دلوں پر اثر کیا کرتی تھی، اس سلسلہ کا ایک واقعہ عرض خدمت ہے ——— لکھا ہے کہ عربی زبان کے مشہور شاعر متنبی ایک مرتبہ اپنے وطن کوفہ واپس آرہے تھے جب بغداد کے سواد میں پہنچے تو ظالم اور خونخوار قزاقوں نے حملہ کر دیا، اوّل مرحلہ میں متنبی اپنے رفقاء کی معیت میں خوب دلجمعی سے لڑا مگر پھر جان بچاکر بھاگ نکلنے کی کوشش کی، اُس کے دلیر اور وفادار غلام نے دیکھا کہ میرا آقا بھاگا جارہا ہے تو اس نے باآواز بلند کہا جس شخص کا یہ شعر ہو اور جو اس قدر جوانمردی کے دعوے کرتا ہو افسوس اور حیف ہے اس پر کہ لوگ اس کی طرف بھاگنے کا تذکرہ بھی زبان پر لائیں، شعر یہ ہے ؎

فالخیل واللیل والبیداء تعرفنی والسیف والرمح والقرطاس والقلم

ترجمہ) رہوارِ جنگ، شبِ تاریک اور بیکراں ریگستان مجھے جانتے ہیں۔ تلوار، نیزہ اور کاغذ و قلم بھی (کہ میں رزم و بزم میں یکتائے روزگار ہوں)

متنبی نے سُنا تو سچی بات دل میں گھر کر گئی اگرچہ اس کے غلام کی طرف سے تھی، یہ سُنکر واپس میدان کی طرف پلٹا اور اتنا لڑا کہ اسی جگہ کام آگیا۔

کتاب کے مطالعہ و استفادہ، ائمہ امت، سلف صالحین اور ارباب علم وکمال کے حیرت انگیز حالات و واقعات سے آگاہی کے بعد خوابِ غفلت، ناعاقبت اندیشی اور آسائش و عیاشی ترک کر کے تحصیل علم، عملِ صالح، فکرِ اُمت، ترویج شریعت اور وحدتِ ملت کے کام میں لگ جانا چاہیئے کہ یہی ایک مسلمان کا فریضۂ منصبی، یہی ملت کا شعار و نشان، یہی ترقی اور کامیابیوں کی ضمانت اور یہی انفرادی اور اجتماعی طور پر فرد اور ملت کے لیے ارتقاء اور رفع درجات کی ضمانت ہے۔

مختلف پیشوں کی اہمیت اور اُنکی مُتناسب تقسیم

(شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا نقطۂ نظر)

مختلف پیشے کیسے وجود میں آتے ہیں

شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کے نظریہ ارتفاقاتِ اربعہ اور انسان کے نوعی تقاضوں کے پیشِ نظر تمدن (کے ارتقا کے مختلف مراحل میں) مختلف پیشوں اور پیشہ ور افراد کا وجود میں آنا ضروری ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں :۔

"اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ جب (نوع انسانی کے) افراد زمین پر پھیل گئے اور ان کی ضروریاتِ زندگی بڑھ گئیں، نیز ہر ایک چیز میں اس کی نفاست کو ملحوظ رکھا جانے لگا تاکہ اس سے آنکھوں کو لطف اور نفوس کو سرور حاصل ہو تو اس صورت میں یہ ممکن نہ تھا کہ ہر ایک فرد اپنی تمام ضروریات کو (اپنے لیے خود) پورا کرے۔ پس ضرورت کے تحت (تمام اقوام نے) اس بات پر اتفاق کیا کہ ہر شخص ایک ہی قسم کی ضرورت کو پورا کرنے پر توجہ دے اور اس کو اچھی طرح انجام دینے کے لیے تمام ذرائع اختیار کرے اور پھر اس ایک (پیداوار یا پیشے) کو مبادلے کے تحت اپنی تمام ضروریات کے حصول کا ذریعہ بنا لے"[1]

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ جلد ا باب فن المعاملات ص ۴۳

درج بالا عبارت میں شاہ صاحبؒ نے معاشرے کے ارتقا میں مختلف پیشوں کے وجود میں آنے اور انسانی معاشرے کی ضروریات میں شامل ہو جانے پر نہایت جامع تبصرہ فرمایا ہے۔

اصولی پیشے شاہ صاحبؒ کے نزدیک اکتسابِ معاش کے بعض پیشے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں جن میں زراعت، گلہ بانی، خشکی وتری کی مباح اشیاء کو اپنے قبضۂ ملکیت میں لانا، تجارت کرنا اور خام مواد میں تصرف کر کے اسے کار آمد بنانے کے لیے صنعتوں کا وجود میں آنا شامل ہے۔ اسی طرح تمدن کی وسعت پر نظام تمدن کو بہتر بنانے والی ملازمتیں بھی پیشوں میں شامل ہو جاتی ہیں اور نئے نئے پیشے وجود میں آنے لگتے ہیں اور لوگ بعض پیشوں میں مہارت اور تخصص حاصل کرنے لگتے ہیں۔ فرماتے ہیں :-

"اکتسابِ معاش کے اصل پیشے یہ ہیں (۱) کھیتی باڑی کرنا، مال مویشیوں کا پالنا (۲) وہ چیزیں جو خشکی اور تری میں غیر مملوک پائی جاتی ہیں، خواہ ان کا تعلق معدنیات سے ہو یا نباتات وحیوانات سے ان کو اپنے قبضے میں لے آنا (۳) نیز وہ صنعتیں جن کے ذریعے عام طور پر پائے جانے والے مواد میں تصرف کر کے انہیں اس قابل بنا دیا جاتا ہے کہ ان سے مطلوبہ ارتفاق میں مدد ملے مثلاً بڑھئی، لوہار اور کپڑا بننے والے وغیرہ کے پیشے۔ پھر تجارت بھی ایک پیشہ بن گئی، اور بعد میں جب تمدن میں کسی قدر وسعت پیدا ہوئی تو یہ بھی ایک پیشہ شمار ہونے لگا کہ آدمی نظام تمدن کو بہتر طریقے پر قائم کرنے میں مدد دے (سرکاری ملازمین وغیرہ اسی نوع میں داخل ہیں) اور پھر (کسب و پیشے کے مفہوم میں اور زیادہ توسیع ہوئی) ہر ایسی جدوجہد کو پیشہ کہا جانے لگا، جس سے نوعِ انسانی کی کوئی ضرورت پوری ہوتی ہو (یا الفاظ دیگر اس سے تمدن کی تکمیل ہوتی ہو) اسکے بعد جیسے جیسے (تمدن نے ترقی کی) نفاست پسندی بڑھتی گئی اور لذت وسرور کی خواہش غالب ہوتی گئی تو مختلف پیشوں کی شاخیں وجود میں آنے لگیں اور ہر شخص کسی نہ کسی پیشے کا ماہر اور متخصص ہونے لگا۔"[1]

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ جلد ا باب فن المعاملات ص ۴۳

پیشوں میں تخصص اور مہارت کے وجود میں آنے کا ذکر کرتے ہوئے شاہ صاحب البدور البازغۃ میں فرماتے ہیں :۔

"ان میں سے ہر گروہ کسی ایک کام پر توجہ دینے لگتا ہے اور بار بار انفرادی توجہ دینے کی وجہ سے اس کام کو اچھی طرح انجام دینے لگتا ہے پس وہ اس کا ماہر بن جاتا ہے اور اس میں باریک بینی کرنے لگتا ہے"۔[1]

پیشوں کی مناسب تقسیم کی ضرورت تمدن کی ترقی کے لیے مختلف پیشوں کا وجود اور تقسیم کار نہایت ضروری ہے اس لیے اگر بہت سے لوگ ایک ہی پیشہ یا چند پیشوں کی جانب متوجہ ہو جائیں اور باقی اہم مکاسب کو نظرانداز کر دیں تو نظام تمدن میں بحران پیدا ہو جائے گا اس لیے حکومت و انتظامیہ کا فرض ہے کہ وہ معاشرے کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے پیشوں کی تقسیم کی نگرانی کرے، جو ضروری پیشے نظرانداز کیے جا رہے ہوں ان میں مناسب ترغیبات پیدا کر کے انہیں رائج کیا جائے اور جن پیشوں پر بیجا ہجوم بڑھ رہا ہو اسے محدود کرنے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔ اس طرح معاشرہ متوازن ترقی کی شاہراہ پر چل سکے گا۔ شاہ صاحبؒ اسی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"یاد رکھو! اگر کسی شہر میں مثلاً دس ہزار نفوس کی آبادی ہو تو سیاستِ مدنیہ کا تقاضا ہے کہ اہلِ شہر کے مکاسب پر گہری نظر ڈالی جائے، کیونکہ اگر ان میں سے اکثر صنعت و حرفت اور سرکاری ملازمتوں میں مشغول ہیں اور معدودے چند افراد ایسے ہیں جو گلہ بانی اور زراعت کا کام کرتے ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ ان کے دنیاوی امور میں فساد برپا ہو جائے گا"۔[2]

کسی خاص پیشے کو اختیار کرنے کی وجوہ شاہ صاحبؒ نے پیشوں کی مناسب تقسیم کی ضرورت کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ

---

[1] البدور البازغۃ۔ صفحہ ۸۶

[2] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲۔ ابواب ابتغاء الرزق صفحہ ۱۰۵

مختلف پیشے اختیار کرنے میں کون سے محرکات کام کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ کسی پیشے کی طرف متوجہ ہونے میں عام طور پر درج ذیل عوامل کام کرتے ہیں:۔

(۱) کسی شخص کی مخصوص ذہنی وجسمانی خصوصیات۔

(۲) ماحول اور وراثت (جس میں باپ دادا کا پیشہ، گردو پیش کے جغرافیائی وطبعی حالات و آلات اور اساتذہ کا میسر ہونا شامل ہے)

(۳) ضرورت اور احتیاج۔

فرماتے ہیں:۔

"کوئی شخص کوئی خاص پیشہ یا کسب دو وجہ سے اختیار کرتا ہے، ایک یہ کہ اس کی خصوصی (ذہنی وجسمانی) استعداد کسی پیشے سے مناسبت رکھتی ہے) مثلاً بہادر آدمی سپاہیانہ زندگی کے لیے، ذہین وتعلیمیافتہ آدمی حساب کتاب (سرکاری ملازمت وغیرہ) کے لیے اور جسمانی لحاظ سے مضبوط آدمی بوجھ اُٹھانے اور بھاری بھرکم کاموں کے لیے مناسب ہوتا ہے۔

دوسری وجہ گرد وپیش کے حالات ہیں۔ لوہار کے بیٹے اور پڑوسی کیلئے لوہاری کا پیشہ زیادہ آسان ہوتا ہے بہ نسبت دوسرے پیشوں کے یا یہ پیشہ دوسرے لوگوں کے لیے، اسی طرح ساحلِ سمندر پر رہنے والے لوگوں کیلئے ماہی گیری کا پیشہ دیگر پیشوں کی بہ نسبت بہت آسان ہوتا ہے[1]"

اس عبارت سے ہمیں بہت سے حقائق کی طرف راہنمائی ملتی ہے مثال کے طور پر یہ کہ:۔

لوگ عام طور پر اپنی جسمانی استعداد اور ذہنی میلان کے مطابق پیشے کو بخوشی اختیار کرتے ہیں اس لیے کسی بچے کو کسی خاص پیشے کی طرف مائل کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کی ذہنی وجسمانی استعداد کا گہرا جائزہ لیا جائے۔ تعلیمی اور ذہنی کاموں کے لیے صرف انہی لوگوں کو منتخب کیا جانا چاہیئے جو فطرتاً سوچ بچار اور تعلیم وکتاب سے متعلق دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس طرح جسمانی لحاظ سے کمزور افراد کو محنت ومشقت کے کاموں پر مجبور کرنے کے بجائے ان کی صلاحیتوں کے

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۱ صہ ۴۳

مطابق کام کر لینے سے زیادہ بہتر نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

آجکل ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک میں بہترین صلاحیتیں رکھنے والے افراد کی کمی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ مختلف پیشوں کے لیے افراد کے مناسب انتخاب کا کوئی فطری نظام موجود نہیں اور فقط کمائی یا عمومی رجحان کے تحت لوگ ایک ہی قسم کے پیشوں کا رُخ اختیار کرتے ہیں جس کی بنا پر معاشرے کے بہت سے اہم گوشے کاریگروں اور ماہرین کی کمی کا شکار ہو جاتے ہیں جبکہ دوسری جانب مشہور پیشوں میں بیروزگاری اور شدید مقابلے کا رجحان بڑھتا رہتا ہے اور یہ دونوں غیر متوازن رُجحانات معاشرے کی ترقی میں رکاوٹ بنتے جاتے ہیں۔

دوسری اہم چیز جسے اقتصادی منصوبہ بندی میں خاص طور پر پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے وہ آب وہوا، ماحول، روایات اور قدرتی ذرائع پیداوار وغیرہ کا وجود ہے۔ چنانچہ دیکھتے ہیں کہ کسی خاص علاقے میں کوئی خاص صنعت یا فن رواج پاتا ہے اور پھر زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ اس میں ایسے ماہرینِ فن اور متخصص پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں جو اس علاقے کی پہچان بن جاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جب کسی علاقے یا قوم کے لوگ ایک پیشہ اختیار کرتے ہیں تو ان کے بچے اپنے بزرگوں کو وہ کام کرتے ہوئے دیکھ کر بہت کچھ سیکھ جاتے ہیں اور اس پیشے سے مانوس ہو جاتے ہیں، پھر جب وہ اس کام کو شروع کرتے ہیں تو اپنی تازہ دم صلاحیتوں اور بزرگوں کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر نئی نئی ایجادات اور اختراعات کو عمل میں لاتے ہیں اور اس طرح ایک مخصوص پیشہ یا فن ترقی کی جانب بڑھتے رہتے ہیں۔

اس سلسلے میں اساتذہ فن اور آلات کا وجود بھی بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب البدور البازغہ میں پیشوں کے انتخاب کی وجوہ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

احدھما تناسب القوی ..... ثانیھما تناسب الارتفاقات من الآلات والاساتذة وغیرہ ذلک [1]	(پیشوں کے انتخاب کی دو بڑی وجوہ) میں سے ایک استعداد کی مناسبت اور دوسری ارتفاقات کے ساتھ آلات اور اساتذہ وغیرہ کا میسر ہونا ہے۔

[1] البدور البازغہ ص ۸۷

مکاسب کے اختیار کرنے کی ایک اور وجہ شاہ صاحبؒ کے نزدیک ضرورت واحتیاج بھی ہے جس کے باعث انسان مجبوراً ایک پیشہ اختیار کر لیتا ہے خواہ اس کے ساتھ اسے طبعی و جسمانی مناسبت ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

"بعض اوقات انسان مجبوری کی وجہ سے بھی کسی پیشے کو اختیار کر لیتا ہے خواہ وہ معزز پیشہ ہو یا ذلیل، جیسا کہ کہا گیا ہے کہ ہر گری پڑی چیز کو کوئی نہ کوئی اٹھا ہی لیتا ہے"[1]

چنانچہ پیشوں کے انتخاب، ترویج اور تربیت کے دوران کسی قوم کے عمومی رجحانات، روایات اور گردو پیش کے قدرتی ذرائع پیداوار کو پیش نظر رکھنا اور پھر افراد کی انفرادی صلاحیتوں اور ان کی ضروریات کا گہرا مطالعہ اور محتاط جائزہ لینا نہایت مفید نتائج پیدا کرتا ہے۔

ضروری پیشوں کی ترویج کے لیے تعلیم و تربیت کی ضرورت

شاہ صاحبؒ کے نزدیک حکومت کیلئے ضروری ہے کہ وہ تمدن کی ترقی کے لیے ایسے تربیتی ادارے قائم کرے جو لوگوں کو مختلف علوم کی تعلیم اور ترغیب دیں تاکہ لوگوں کو نئے نئے علوم مکاسب اور فنون کا علم ہو سکے۔

دوسری اہم چیز تعلیم و تربیت حاصل کرنے والوں کی نفسیاتی، طبعی اور ذہنی و جسمانی استعداد کی نگرانی کرنا ہے، جیسا کہ پچھلی سطور میں ان عوامل و محرکات کی اہمیت کا ذکر کیا گیا ہے چنانچہ شاہ صاحبؒ ان حقائق پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"اہلِ شہر کو آمادہ کیا جائے کہ وہ نوشت و خواند، حساب کتاب، تاریخ، طب اور علمی ترقی کے صحیح ذرائع کو ترقی دیں اور (حاکم کیلئے ضروری ہے کہ) وہ اپنے آپ کو ملک کے حالات سے اچھی طرح باخبر رکھے تاکہ غلط کردار اور نیک چلن افراد کا اس کو پورا پورا علم ہو، محتاج کی اعانت کی جائے اور جو لوگ کسی خاص علم و فن میں مہارت کی استعداد رکھتے ہوں ان کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ ان کی پوشیدہ قابلیت کے جوہر ظاہر ہو کر حکومت و معاشرے کیلئے سود مند ثابت ہوں"[2]

---

[1] البدور البازغہ ص ۸۷ [2] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۱

اسی طرح شاہ صاحبؒ پیشہ و ہنر کی تربیت کے سلسلے میں اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کوئی کام سیکھنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کے بارے میں اجمالی علم حاصل کیا جائے، پھر اس کیلئے ضروری آلات کو پہچانا جائے اور اس کے موٹے موٹے اصول سیکھنے پر توجہ دی جائے۔ بعد میں جب کچھ مہارت حاصل ہو جائے تو فن کی باریکیوں پر توجہ مرکوز کرنی چاہیئے، چنانچہ شاہ صاحبؒ رقمطراز ہیں :-

"جب آدمی کسی پیشے کو شروع کرے تو پہلے اسے اس کے آلات اور اصولی باتوں پر نگاہ رکھنی چاہیئے اور جب وہ ان کو اچھی طرح سیکھ لے تو پھر اس (فن) کی گہرائیوں اور باریکیوں پر توجہ دینی چاہیئے[1]"

پیشہ صرف تقلید کے طور پر اختیار نہیں کرنا چاہئے

شاہ صاحبؒ کے نزدیک کوئی پیشہ اختیار کرتے وقت پوری بصیرت سے کام لینا ضروری ہے جس طرح ماحول سے مطابقت اور قریبی لوگوں کے مخصوص پیشے کی بدولت نئے افراد کو آسانی اور سہولت حاصل ہوتی ہے، اسی طرح کسی پیشے کے انتخاب کے سلسلے میں اندھا دھند تقلید اور روایات کی پیروی بھی بعض اوقات وبالِ جان ثابت ہوتی ہے، اسلئے ضروری نہیں کہ کسی فرد کی ذہنی و جسمانی استعداد اور طبعی میلان لازماً اپنے والدین یا گرد و پیش کے مطابق ہو۔ اس طرح عام لوگوں کے رجحان کو دیکھتے ہوئے بغیر سوچے سمجھے کوئی پیشہ اختیار نہیں کرنا چاہیئے، فرماتے ہیں :-

"لوگوں میں اکثر ان کے باپ دادا کی بغیر سوچے سمجھے تقلید فساد کا باعث بنتی ہے پس وہ اپنے ہجولیوں کے پیشے اختیار کر لیتے ہیں جو ان کیلئے مناسب نہیں ہوتے[2]"

شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اگر کسی پیشے کا کسی شخص کے لیے کسی لحاظ سے نامناسب یا مشکل ہونا معلوم ہو جائے تو فوراً اسے چھوڑ کر دوسرا مناسب پیشہ اختیار کر لینا چاہیئے۔ اس باب میں ان کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے :-

"جب کسی شخص کے لیے کوئی پیشہ مشکل بن جائے تو اسے چھوڑ دینا چاہیئے اس لیے کہ ہر شخص کسی خاص کام کے لیے ہی پیدا کیا گیا ہے[3]"

---

[1] البدور البازغہ ص ۸۸ [2] ایضاً [3] ایضاً

طبعی میلان کے خلاف پیشہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں کرنا چاہیئے

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ خالق کائنات نے مختلف انسانوں کے مزاجوں میں مختلف خواص اور صفات رکھ دی ہیں، اس لیے اگر ان کی صحیح تشخیص کر کے ان سے صحیح کام لیا جائے تو یہ بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس طبعی میلان و مزاج کے خلاف جبراً کسی سے کوئی کام لینا حکمت کے خلاف ہے، اس لیے کہ بعض لوگوں میں ذمہ داری کا احساس اور قیادت کے اوصاف پائے جاتے ہیں اور وہ بہت سے لوگوں کو ساتھ لے کر آسانی سے چل سکتے ہیں، جبکہ بعض لوگ کسی قائد یا راہنما کے بغیر ایک قدم اٹھانے کے قابل نہیں ہوتے، اس لیے پیشہ اور ذمہ داری کسی کے حوالے کرتے وقت اس کے ان اوصاف کو مدِنظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ تحریر کرتے ہیں:۔

"اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں میں سے ایک مہربانی یہ بھی ہے کہ اس نے انسان کو مختلف مراتب کے مطابق پیدا کیا ہے، بعض ان میں سے فطری طور پر غلامانہ (تابع فرمان) طبیعت کے مالک ہوتے ہیں جو اپنی کم ہمتی کے باعث اپنے معاشی امور پر اختیار نہیں رکھتے، وہ تو گویا اس لیے ہی پیدا ہوتے ہیں کہ اپنے آقاؤں کا اتباع کریں اور ان کے زیرِ دست رہ کر ان کے احکام بجا لائیں، اس قسم کا شخص اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتا جب تک اسے ایک آقا نہ مل جائے، اور بعض ان میں سے قائدانہ مزاج کے حامل ہوتے ہیں، وہ زبردست شخصیت کے مالک، عالی ہمت اور مکاسب میں ہمہ گیری کے حامل ہوتے ہیں، وہ اپنے زیردستوں کا بوجھ اٹھاتے اور ان کی راہنمائی کرتے ہیں۔ پھر حاکموں اور آقاؤں کے بہت سے امور ایسے ہوتے ہیں جو محکوموں کی اعانت کے بغیر انجام نہیں دیئے جا سکتے اور محکوموں کی بہت سی حاجات ہوتی ہیں جو حاکموں کی اعانت کے بغیر پوری نہیں ہو سکتیں، پس اس (باہمی تعاون) کی بناء پر ان کے امورِ معاشں کا انتظام بہترین انداز میں ہو جاتا ہے۔[1]"

---

[1] البدور البازغہ ص ۷۹

اسی طرح شاہ صاحبؒ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:۔

والحکمة تفید ان یعامل بالطبیع لا بالتعسر ؎۱

حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ (کوئی بھی) معاملہ طبیعت اور مزاج کے موافق ہونا چاہیئے نہ کہ جبر اور زبردستی سے۔

کسب سکھانے میں والدین کی ذمہ داری

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اولاد جب بالغ ہونے لگے تو دیگر امور کی طرح ان کے کسب معاش کے اسباب تلاش کرنے میں ان کی مدد کرنا بھی والدین کی ذمہ داری ہے، فرماتے ہیں:۔

ثم لابد من تعلیم العلوم النافعة فی معاشه ومعاده واذا کبر فلیزوجه ولیعلمه کسبا یلیق امثاله ؎۲

یعنی (بچے کی ابتدائی نشوونما کے بعد) لازمی ہے کہ اس کے معاش اور معاد کے متعلق ضروری نفع بخش تعلیم دی جائے اور جب وہ بڑا ہو جائے تو اس کی شادی کی جائے، اسے ایسا پیشہ اور ہنر سکھایا جائے جو اس جیسے دوسرے ساتھیوں کے شایان شان ہو۔

پیشہ اختیار کرتے وقت کن مقاصد کو پیش نظر رکھنا چاہیئے

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ کوئی پیشہ اختیار کرتے وقت دو چیزوں کو خاص طور پر مدنظر رکھنا چاہیئے ایک تو یہ کہ اس پیشے سے اتنی معقول آمدنی ہو سکے جو اس کی ضروریات کے لیے کافی ہو اور دوسرے یہ کہ اس پیشے میں اجر و ثواب کو مدنظر رکھے۔ ظاہر ہے کہ ایسا پیشہ وہی ہو سکتا ہے جو حرام و ناجائز نہ ہو اور معاشرے کے لیے کسی نہ کسی طور سے مفید ہو۔

وللکاسب مقامان ینبغی ان یتانق فیهما ویعمل بدایة العمیق: احدهما اقتناء صنعة تکفیه وثانیهما صرفه علی قصد تحری ثواب ؎۳

یعنی پیشہ ور کیلئے دو امور ایسے ہیں جن میں اسے گہرے غور و فکر سے کام لینا چاہیئے، ایک یہ کہ وہ ایسا پیشہ اختیار کرے جو اس (کی ضروریات) کے لیے کافی ہو اور دوسرے اس میں اجر و ثواب کے حصول کی نیت بھی شامل ہو۔

؎۱ البدور البازغہ ص۸۴ ؎۲ ایضاً ص۸۳ ؎۳ ایضاً ص۸۸

روزگار کی اہمیت

شاہ صاحبؒ ایک صحتمند معاشرے کے ہر فرد کے لیے روزگار اور کسب کی ضرورت پر زور دیتے ہیں، ان کے نزدیک ہر فرد کی محنت مزدوری اور ہاتھ کی کمائی انفرادی و اجتماعی فلاح کے لیے اشد ضروری ہے اس لیے کہ سوسائٹی کے افراد ہاتھ کی کمائی اور محنت چھوڑ کر دوسروں کی کمائی پر نظر جمالیں اور گداگری یا دیگر حیلوں بہانوں سے مال بٹورنا شروع کردیں تو یہ معاشرے کی بربادی اور ہلاکت کا سبب بن جائے گا، فرماتے ہیں:۔

"چونکہ انسان مدنی الطبع ہیں اور آپس کے تعاون کے بغیر وہ اپنے لوازم حیات بہم نہیں پہنچا سکتا اسلئے شرائع میں ان کو باہمی تعاون کا حکم دیا گیا ہے تاکہ سوسائٹی کا ایک فرد بھی عذرِ معقول کے بغیر بیکار اور بیروزگار نہ رہے[۱]"

گداگری اور مُفت خوری تمدن کے لیے روگ ہیں

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ شریعت میں بلاضرورت دستِ سوال دراز کرنے والوں کے لیے سخت وعید کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ اس قبیح عمل سے لوگوں کو روکا جائے، اس لیے کہ اس کا عادی ہوجانا اور اسے اختیار کرلینا معاشرے کی بربادی کا باعث بنتا ہے، فرماتے ہیں:۔

"اگر بھیک کو غیر معیوب سمجھ کر عادت بنالیا جائے اور لوگ اس سے نہ شرمائیں اور اسے مال کمانے کا ذریعہ بنالیا جائے تو یہ بہت سے ایسے پیشوں کے معدوم ہوجانے کا ذریعہ بن جائے گی جن کا وجود تمدن کی ترقی کے لیے ضروری ہے[۲]"

اسی طرح شاہ صاحبؒ ایسے پیشوں کے بھی سخت خلاف ہیں جن کا مقصد فقط چالاکی کے ذریعے مال جمع کرنا ہے اور معاشرے کی کوئی مفید خدمات سرانجام دینا مقصود نہ ہو، لکھتے ہیں:۔

"اس زمانے میں شہروں کی بربادی کے دو بڑے سبب ہیں، اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے دوسرے پیشوں کو چھوڑ کر خود کو حکومت کے دامن سے وابستہ کر رکھا ہے اور ان کا تمام بوجھ بیت المال پر ہے (اور وہ اس بنا پر خود کو اس کا مستحق سمجھتے ہیں) کہ وہ غازی ہیں یا علماء ہیں یا ان لوگوں میں سے

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ صفحہ ۴۶ [۲] ایضاً

ہیں جن کو عام طور پر بادشاہ انعام واکرام سے نوازتے ہیں، جیسے زاویہ نشین فقرا، اور درباری شعرا، یا کسی نئے طریقے سے بھیک مانگنے والے ہیں، ان کے پیشِ نظر فقط یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنا پیٹ بھریں اور معاشرے کی کوئی خدمت انجام نہ دیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک جماعت دوسری جماعت کا مقابلہ کرتی ہے، پھر آپس میں یہ ایک دوسرے کے لیے پریشانی کا باعث بنتے ہیں اور یہ لوگ حکومت پر بوجھ بن جاتے ہیں[1]۔

بیروزگاری جرائم کا باعث ہے

شاہ صاحبؒ کے نزدیک معاشرتی بہبود کیلئے ضروری ہے کہ جہاں تک ممکن ہوسکے کوئی فرد بیکار نہ رہے، اس لیے کہ بیکار افراد کا وجود نہ صرف معاشرے کی مالیات کیلئے مضرت رساں ہے بلکہ اس کی بدولت بہت سے اخلاقی جرائم بھی جنم لیتے ہیں، فرماتے ہیں:۔

وبقیت نفوس اعیت بہم المذاھب الصالحۃ فانحدوا الی اکتساب ضارۃ بالمدینۃ کالسرقہ والقمار والتکدی[2]	بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کسی (وجہ سے) جائز ذرائع سے کمائی میں ناکام رہتے ہیں، پھر وہ چوری، جوا بازی اور بھیک جیسے مضر پیشے اختیار کر لیتے ہیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ محمدٍ وآلہٖ وصحبہٖ اجمعین۔ برحمتك یا ارحم الراحمین۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ جلد ا صفحہ ۴۵ [2] ایضاً صفحہ ۴۳

مفتاح کنوز السنۃ

احادیثِ نبویہ کا مکمل و مفصل انڈکس جو حدیث کی چودہ ۱۴ اہم اور مشہور ترین کتابوں کے حوالوں پر مشتمل ہے۔ جس کی مدد سے چند سیکنڈ میں یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ کون سی حدیث کس کتاب میں کس باب کے تحت کس صفحہ پر وارد ہوئی ہے۔

اس انڈکس میں مندرجہ ذیل کتبِ حدیث کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

(۱) صحیح البخاری (۲) صحیح مسلم (۳) سنن ابوداؤد (۴) الترمذی
(۵) النسائی (۶) ابن ماجہ (۷) موطا امام مالک (۸) الدارمی
(۹) مسند زید بن علی (۱۰) ابوداؤد الطیالسی (۱۱) مسند احمد بن حنبل
(۱۲) طبقات ابن سعد (۱۳) سیرت ابن ہشام (۱۴) مغازی الواقدی